المنار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روشنی اور بلندی کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

نگران:-
پروفیسر بشارت الرحمن
ایم-اے

ترتیب دینے والے:-
مطیع اللہ درد
سمیع اللہ قریشی
ناصر احمد پرویز

جلد ۴ ماہ نومبر ۱۹۵۶ء شمارہ ۴

زیرِ نظر

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۳
۲	لطفِ نگاہِ اوّلیں (نظم)	کلام الامام (ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز)	۴
۳	خدائی فوجدار	پروفیسر نصیر احمد خاں ایم۔ ایس۔ سی	۵
۴	محترم دوست	م۔ روفی	۱۰
۵	تعلیم الاسلام کالج ربوہ	پرویز پروازی	۱۴
۶	تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا افتتاح (نظم)	پروفیسر نصیر احمد خاں ایم۔ ایس۔ سی	۱۵

جذباتِ تشکّر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا
لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ
فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝

(القرآن۔ سورۃ فاطر آیت ۳۵)

(ترجمہ) تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہی ہیں جس نے ہم سے سختی کو دُور کر دیا۔ یقیناً ہمارا رب کمزوریوں اور گناہوں پر پردہ ڈالنے والا اور بہت قدردانی کرنے والا ہے۔ وہ جس نے ہمیں اپنے فضل سے (مستقل) قیام والے گھر میں اُتارا۔ ہمیں اس میں کوئی تکلیف نہ چھوئے گی اور نہ ہی اس میں ہمیں کوئی تھکان چھوئے گی ؎

(پبلشر: جنید ہاشمی نے انشاء پریس لاہور سے چھپوا کر ربوہ سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ ہمارا کالج لاہور کے مادی مرکز سے ربوہ کے روحانی مرکز میں منتقل ہو چکا ہے۔ ربوہ کی بستی میں کالج کی نئی عمارت ابھی تشنۂ تکمیل ہے لیکن جس سرعت اور تیزی سے نامکمل حصوں کو مکمل کیا جا رہا ہے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں ایک عظیم الشان اور دیدہ زیب عمارت کا نظارہ قریب ترین پہاڑی کی چوٹی سے بہت دلکش و دلآویز ہوگا۔ گاڑیوں کے مسافر حسرت و استعجاب سے 'علم و عمل' کی اس درسگاہ کو چند لمحوں کے لئے موضوعِ گفتگو بنانے پر مجبور ہوں گے ——— اس کی تعمیر کے سلسلے میں جناب پرنسپل کی شبانہ روز کوشش، محنت و جانفشانی اور کڑی نگرانی کو بہت دخل حاصل ہے۔ آپ کی راہبری میں اور قلیل ترین عرصہ میں چند کھنڈرے، بغیر زیبائش کے کمروں نے جس طریق پر طلباء کو اپنے دامن میں لیا ہے وہ قابلِ صد تحسین و ستائش ہے اور طلباء میں اجنبیت کے احساس کا قطعی فقدان ان کمروں سے مانوسیت کی بیّن دلیل ہے۔ اکثر طلباء نے ان خیالات و افکار کا اظہار بشاشت اور خندہ پیشانی سے کیا ہے کہ یہاں دلجمعی اور سکون کے ساتھ پڑھائی کی جا سکتی ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو کشاں کشاں طلباء کو کامیابی و کامرانی سے دوچار کر دیگا۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ نئے آنیوالے طلباء ہمارے کالج کی سابقہ روایات کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہیں اور زیادہ بلند کرنے کی کوشش کرینگے تعلیمی اور ادبی معیار کی بلندی طالب علم کی ذاتی دلچسپی کی مرہونِ منت ہوتی ہے لہٰذا طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سنجیدہ نظری، مسلم شعاری، فرض شناسی اور وقار سے کالج کے ہر پروگرام کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہونگے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کے لئے اس درسگاہ سے پورا پورا استفادہ کرنا طلباء کا مقصد ہونا چاہیئے۔

اب آخر میں ہم طلباء کو وہ روایات یاد دلانا چاہتے ہیں جو تعلیم الاسلام کالج سے وابستہ ہیں۔ اس کالج کا سب سے بڑا مقصد دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی ترویج و ترقی ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے کالجوں سے ممتاز درجہ دیتی ہے۔ کالج کی فضاء کو فرقہ وارانہ تعصب سے پاک رکھا جاتا ہے۔ ہر طالب علم اپنے مخصوص مذہبی عقائد پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کالج کی سماجی زندگی میں آزادانہ حصہ لے سکتا ہے۔

———

کالج کے تعلیمی عملہ کے سرگرم ارکان جناب اخوندھا صاحب اور نصیر صاحب کے ہاں فرزند تولد ہوئے ہیں اور نوآموز پروفیسر جناب مسعود احمد صاحب عاطف کی شادی خانہ آبادی کی تقریب پچھلے دنوں لاہور میں منعقد ہوئی۔ ادارہ "المنار" اوّل الذکر اصحاب کے بیٹوں کی درازیٔ عمر اور نیکنامی کے لئے دعا گو ہے اور ثانی الذکر کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اس نئے جوڑے کو اپنی رحمتوں اور فضلوں سے وافر حصہ عطا فرمائے۔ آمین۔ آخر میں ادارہ تینوں پروفیسروں کی توجہ اس "مطالبہ" کی طرف منعطف کراتا ہوا عموماً ایسے لوگوں سے کیا جاتا ہے۔ بطور اطلاع عرض ہے کہ اس "مطالبے" کا آغاز اور اختتام شیریں ہوتا ہے +

تازہ کلام حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (ایدہ اللہ تعالیٰ)

لطفِ نگاہِ اوّلیں

آدم سے لیکر آج تک پیچھا ترا چھوڑا نہیں
شیطان ساتھی ہے ترا لیکن ہے وہ بئس القریں
گو بارہا دیکھا انہیں لیکن وہ لذّت اَور تھی
دل سے کوئی پوچھے ذرا لطفِ نگاہِ اوّلیں
اُن سے اسے نسبت ہی کیا وہ نور ہیں یہ نار ہے
گر وہ ملائے تو ملیں ان کے قدم میری جبیں
سو بار تو یہ توڑ کر جھکتی نہیں میری نظر،
جھکتی ہے ناکردہ گنہ اُن کی نگاہِ شرمگیں
آنے کو وہ تیار تھے مَیں خود ہی کچھ شرما گیا
اُن کو بٹھاؤں مَیں کہاں دل میں صفائی تک نہیں
ابدال کیا اقطاب کیا جبریل کیا میکال کیا
جب تو خدا کا ہو گیا سب ہو گئے زیرِ نگیں
اس پر ہوئے ظاہر محمد مصطفےٰ حِبُّ الوریٰ
بالا ہے نہ افلاک سے کرّوبیو! میری زمیں
کھولا ہے کس تدبیر سے بابِ لقائے دلرُبا
آئے ہیں کس انداز سے اوڑھے رِدائے المرسلیں
آ دوست دامن تھام لیں ہم مصطفےٰ کا زور سے
ہے اک یہی بچنے کی رہ ہے اک یہی حبل المتیں
کیا فکر ہے تجھ کو اگر شیطان ہے بازی لے گیا،
دُنیا خدا کی مِلک ہے تیری نہیں میری نہیں

پروفیسر نصیر احمد خاں
ایم۔ایس سی

خدائی فوجدار

"وہ ملعون ہے" مولوی ضیاء الحق صاحب دیناج پوری نے ع کی آواز حلق سے نکالتے ہوئے فرمایا۔

"کون ؟" شیخ عماد الدین نے سہم کر پوچھا۔

"رحمت علی" مولوی صاحب موصوف نے اس جلال اور غیظ و غضب سے نام کا اعلان فرمایا کہ ریشِ مبارک کا ایک ایک بال خشک ٹہنی کی طرح تن گیا۔

"کیا غلطی سرزد ہو گئی اس سے ؟"

"تم نے صُورِی اور مَعْنوِی دونوں لحاظ سے غَلَطْ کہا۔ غَلَطی نہیں وہ تو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے۔ کل شام جب وہ مغرب کی نماز کے لئے مسجد میں آیا تو اس کی دھوتی اس کی ایڑیوں کے پیچھے جھاڑو دے رہی تھی اور تکبر اور نخوت اور رعونت کے منحوس خیالات اس کے چہرے سے مَیں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی دی ہوئی فراست سے اس طرح پڑھ لیے جس طرح ایک مومن مسلمان کسی مغرب زدہ نوجوان کی چال ڈھال سے اس کے کفر و نفاق پر اطلاع پا جاتا ہے۔"

"آپ نے اسے نصیحت تو فرمائی ہو گی" عماد الدین نے مریدانہ تذلّل سے دریافت کیا۔

"نصیحت" مولوی صاحب کڑک کر بولے "یہ تو ایمان کا دوسرا درجہ ہے۔ فرماتے ہیں حضرت رسول عربی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (میرے ماں باپ آپ پر قربان) کہ جو کوئی بُری بات دیکھے پس اُسے اپنے ہاتھ سے درست کرے اور اگر اس کی استطاعت نہ پائے تو زبان سے سمجھائے اور اگر اس پر بھی قدرت نہ ہو تو دل میں بُرا مانے۔ وھٰذا اضعف الایمان۔ لہٰذا مَیں نے جب اپنی چھڑی رحمت علی کے ٹخنوں پر آہستہ سے ماری تاکہ اُسے عذابِ جہنم سے خبردار کر دوں تو اس نے نہایت گستاخی سے میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ جواب دیئے مسجد سے باہر چلا گیا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس نے رحمت کے دروازے اپنے لئے بند کر لئے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ اللہ عزّ و جلّ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے۔"

مولوی ضیاء الحق صاحب دیناج پوری بہت بڑے عالم تھے۔ علاقے بھر میں ان کے علم و فضل کا چرچا تھا۔ ان کی پارسائی اور زہد و عبادت کے قصّے اب قصبہ کی حد تک محدود نہ رہے تھے بلکہ اردگرد کے تمام مضافات میں مشہور و معروف ہو چکے تھے۔ قصبہ کی عورتیں تعویذ گنڈے کے لئے آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھیں۔ چوہدری قطب الدین جب کبھی مال مویشی خریدنے کے لئے منڈی جاتا تو قبلہ مولوی صاحب سے سودے کے بابرکت ہونے کے لئے دعا کراتا اور نذرانے کے طور پر بھینس کے دودھ کی کھیر پکوا کر ان کی خدمت میں ضرور بھجواتا۔ موت فوت، شادی بیاہ، غرضیکہ ہر موقع پر مولوی صاحب کی موجودگی بہت بابرکت خیال کی جاتی۔ مولانا موصوف کو بھی لوگوں سے بہت لگاؤ تھا اور ان کے جذبات کا خیال حتی المقدور پیشِ نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک نکاح کے موقع پر جب آپ خطبہ شروع فرما چکے

تو لڑکے کے والد کو ایک ضروری کام انتظام بارات کے متعلق آپڑا۔ آہستہ سے مولوی صاحب کے کان میں کہنے لگا۔ "مولوی جی! ذرا آیت لمبی کر دیجئے گا میں ابھی آیا۔" آپ کی تالیفِ قلب دیکھیے کہ جب تک وہ شخص اطمینان سے فارغ ہو کر واپس نہ آگیا آپ نے خطبہ برابر جاری رکھا۔ اور ایجاب و قبول تک نوبت نہ پہنچنے دی۔ اب تو قبلہ پیرانہ سالی کے سبب زیادہ بھاگ دوڑ نہ کر سکتے تھے ورنہ جوانی کے زمانے میں اگر فجو کا نکاح صبح ایک گاؤں میں پڑھ کر آتے تو دوپہر کو زینب کے لڑکے کا جنازہ دوسرے گاؤں میں جا پڑھاتے تھے۔

صدقہ جاریہ کے طور پر آپ نے اوائل جوانی ہی میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ شروع فرما دیا تھا اور اب تو آپ کے تلامذہ کی تعداد دس سے ترقی کر کے چالیس کے مبارک عدد تک پہنچ چکی تھی۔ آپ بہت فصیح البیان تھے۔ جب تقریر فرماتے تو یوں محسوس ہوتا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ علم حدیث، فقہ اور زبانِ عربی میں بڑے بڑے فاضل آپ کا لوہا مانتے تھے۔ آپ کے تبحرِ علمی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جب آپ خطبہ ارشاد فرماتے اور جلال میں آجاتے تو ہر الف عین اور ہر کاف قاف میں تبدیل ہو جاتا۔ اسی پر بس نہیں، نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ کچھ عرصے کے بعد سوائے عین اور قاف کی آوازوں کے اور کچھ سنائی نہ دیتا۔

دشمنانِ دینِ متین کے حق میں مولوی صاحب ایک ننگی تلوار کا حکم رکھتے تھے۔ خلافِ شرع باتیں تو کجا مکروہات تک کو بھی آپ گوارا نہ کر سکتے اور سختی سے ان کا قلع قمع فرماتے تھے۔ جہنم کے عذاب سے آپ اکثر ڈرایا کرتے تھے۔ آپ کے خطبات میں جنت کی دلفریبیوں کی نسبت دوزخ کی ہولناکیاں زیادہ مذکور ہوتی تھیں۔ آپ کا قول تھا کہ محبت کی نسبت ڈر اور وعدے کی نسبت وعید زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ اور تائید میں قومِ لوط اور طوفانِ نوح کے واقعات کچھ اس انداز سے پیش فرماتے کہ مریدانِ باصفا پر رعشہ طاری ہو جاتا اور اکثر کی ڈر کے مارے گھگی بندھ جاتی۔

پست قامت۔ فربہ جسم۔ اُبھری ہوئی توند۔ ناف کے نیچے کس کر بندھا ہوا شرعی پاجامہ۔ لمبی خضاب زدہ داڑھی اور ایک موٹا عصا آپ کی ہیئت کذائی کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ موسم سرما میں جب آپ جمعرات کے روز اپنی داڑھی کو خضاب لگاتے تو ظہر کی نماز اکثر قضا ہو جایا کرتی تھی۔ چنانچہ بطور کفارہ جمعرات کی شام آپ نے استغفار اور انابت الی اللہ کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ کفار و مشرکین سے آپ بات تک کرنا پسند نہیں فرماتے تھے اور ان پر سختی کرنے کے قائل تھے۔ اکثر آیتِ کریمہ واغلظ علیہم آپ ورد زبان رکھتے۔ جب کبھی کسی کافر سے آپ کی آنکھیں چار ہو جاتیں تو چہرہ مبارک سُرخ ہو جاتا اور آنکھیں شعلے برسانے لگتیں۔ اگر وہ بدبخت گفتگو پر آمادہ ہو جاتا تو آپ کے مُنہ سے جھاگ نکلنے لگتی۔ آپ کا ایمان تھا کہ جب تک انسان کے دل میں غیر اللہ اور کفار و مشرکین کیلئے قطعی نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہو جاتا اُس وقت تک وہ اسلام کی سرحد کے قریب بھی پھٹکنے نہیں پاتا۔

کفار سے بھی زیادہ آپ کو منافقین کی فکر تھی اور نئی روشنی کے مغرب زدہ نوجوانوں اور کتاب اللہ کے متعلق طرح طرح کے سوالات پوچھ کر اس میں شک لانے والوں کا مقام آپ نارِ جہنم سے بھی اسفل سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک انگریزی خواں نوجوان نے کسی آیتِ قرآنی کے متعلق سوال کر دیا تو آپ طیش میں آگئے۔ انجام سے غافل نوجوان نے اپنے سوال پر اصرار کیا پھر کیا تھا جہاد

کی تمام خفتہ قابلیتیں آپ کے وجودِ مقدس میں یکلخت بیدار ہوگئیں اور آپ نے اپنے موٹے عصا سے اس نوجوان کو رموزِ شریعت سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار سُن کر لوگ جمع ہوگئے اور بڑی مشکل سے اس کو ادھ موا ہونے کی حالت میں چھڑا کر لائے۔ اگر عوام کالانعام اس کارِ خیر میں فراہم نہ ہوتے تو مجاہدِ مذکور نے اسے فی النار کر دیا ہوتا اور خود غازی کے لقب کا حق دار بن گیا ہوتا۔ مگر ؎

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

اب تو آپ مجبوراً دوسرے درجۂ ایمان پر ہی قانع رہنے لگے تھے اور زبان سے سخت سست کہنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ تاہم نیکی اور غیرتِ دینی کے وہ واقعات جن پر ہمیشہ آپ کو ناز رہا ان میں سے ایک واقعہ حاملہ اونٹنی کا بھی ہے۔

شیخ عماد الدین آج بڑی منت سماجت سے مولوی ضیاء الحق صاحب کو اپنے ہاں کھانے پر آنے کے لئے راضی کر سکا تھا۔ درحقیقت آپ کا معدہ کمزور تھا اور ثقیل غذا ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس ظلوماً جہولاً نے بہت کام کیا ہے اب اسے قدرے آرام اور نرم غذا کی ضرورت ہے۔ جب عماد الدین نے یقین دلایا کہ شوربہ مرغ اور حلوے کے سوا تیسری کوئی چیز دستر خوان پر نہیں ہوگی تو مجبوراً آپ کو سنتِ نبوی کے مطابق دعوت قبول کرنا پڑی۔ کھانا شروع ہوا۔ عماد الدین کو کھانے کے ساتھ پانی زیادہ پینے کی عادت تھی۔ مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ قریباً ہر لقمہ کے ساتھ عماد الدین گلاس میں سے کسی چیز کے گھونٹ پیتا جاتا ہے تو تحقیقِ حق کی جستجو پیدا ہوئی۔ دستر خوان کی دوسری جانب بیٹھے تھے گردن لمبی کر کے گلاس میں جھانکا اور فرمایا "یہ کیا شے ہے؟"

"پانی ہے" عماد الدین نے جواب دیا۔

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں نے خیال کیا کوئی بہتر شے ہوگی۔ خیر ویسے تو پانی بھی اللہ عزوجل کی نعماء میں سے ایک نعمتِ عظیمہ ہے لیکن میں نے سوچا اگر کوئی لطیف تر چیز شرب کی تھی تو تحدیثِ نعمت کے طور پر اس کا اظہار لازم تھا۔"

"حضرت! شوربہ آپ کو پسند آیا؟"

"سبحان اللہ۔ فالحمد للہ۔ بھئی میں تو اکثر سوچتا ہوں کہ اگرچہ من و سلویٰ جو قومِ موسیٰ پر نازل کیا گیا کچھ اور شے ہے تاہم مرغ کا مزہ بھی ہو بہو ویسا ہی ہے۔ دل شہادت دیتا ہے اور زبان حظ اٹھاتی ہے اور معدہ نہیں کہتا مگر وہی جو ان دونوں نے سمجھا۔ عماد الدین! تم نے ہمارے لئے اتنی تکلیف کی۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ آج ایک نکتہ تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ اگرچہ اعلان اس کا جہلاء پر شاق اور اس احقر کے لئے موجب ہزار بلاؤں کا ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی اس کے اظہار سے رُک نہیں سکتا اور وہ یہ کہ مومن مسلمان کو ہمیشہ قومِ موسیٰ سے سبق لینا چاہیئے اور لحم ہی کو بطور غذا استعمال کرنا چاہیئے۔ قومِ یہود نے من و سلویٰ کے عوض دال اور سبزیوں کی خواہش کی تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم بدلتے ہو اس چیز کو جو ادنیٰ ہے بدلے اُس کے کہ جو بہتر ہے۔ قسم ہے مجھے اس رب العالمین کی کہ جس کے ہاتھ میں میرا رزق ہے کہ اگر یہ عاجز انتہا درجہ کا رقیق القلب نہ ہوتا اور غریب مسلمین کے لئے اس کی ہمدردی اور ترحمی اشد اشد حالت کو نہ پہنچ چکی ہوتی تو قرآنِ حکیم سے ثابت کر دکھاتا کہ مومن مسلمان کے لئے دال کھانا حرام اور قطعی حرام ہے۔"

"قرآنِ حکیم سے دال کی حرمت۔ عجیب بات ہے۔"

"عوام کے لئے بے شک عجیب ہے لیکن اہلِ علم کیلئے یہ بات کچھ بھی مشکل نہیں یعنی آسان بلکہ سہل ہے۔ درحقیقت

کتاب اللہ مثل ایک سمندر کے ہے اور عالم بطور غوطہ زن عالم جب بھی غوطہ لگاتا ہے مفید مطلب موتی نکال لیتا ہے اور دال کی حرمت تو مبتدی بھی معلوم کر سکتا ہے۔ وقال اللہ تعالیٰ وضُرِبَت علیهمُ الذِلّةُ والمسکنةُ وباءُوا بغضَبٍ مِّن اللہِ۔ پس دال کی خواہش کرنا ذلت اور مسکنت اور غضب الٰہی کا مورد بننا ہے۔ اور مغضوب علیہم یہود ہیں جو غیر مسلم ہیں۔ لہذا جو دال کی خواہش بھی کرے وہ کافر ہے اور جو اس کے کافر ہونے میں شک لائے تو گویا شک کیا اس نے بیچ کتاب اللہ کی کے پس تحقیق لازم آیا اُسے بھی کفر۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکفرُ مِلّةٌ واحدة۔ پس یہودی کے کفر اور دال کھانے والے مسلمان کے کفر اور اُسے کافر نہ سمجھنے والے شخص کے کفر میں کچھ بھی فرق نہ ہوا۔ لہذا پرہیز لازم بلکہ واجب بلکہ فرض ہوا۔ فماذا بعد الحق الّا الضلال وما علینا الّا البلاغ۔"

"حضور عالم ہیں سچ فرماتے ہوں گے لیکن خاکسار یہ عرض کرتا ہے کہ یہ بات عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ محض دال کھانے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔" عماد الدین نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"عقل کس بلا کا نام ہے؟ تم کلام اللہ پر اپنی ناقص اور کھوٹی عقل کو مقدم کرتے ہو۔ تمہارے ایسے لوگوں کے متعلق ہی اللہ جلّ شانہ نے فرمایا ہے کہ اَلَآ اِنّھم ھُمُ السُّفھاءُ۔ خبردار! تحقیق البتہ یقیناً وہی بے وقوف ہیں لیکن نہیں سمجھتے۔ غافل انسان! عقل سے کچھ نہیں بنتا۔ اصل چیز جنون ہے۔ علامہ اقبال (اگرچہ ان کے اسلام کے متعلق بھی مجھے شبہ ہے تاہم) سچ فرماتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا نمرود کی آتش میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی"

"قبلہ! پہلا مصرعہ تو غالباً یوں ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق"

"ہوگا۔ مجھے اس سے کیا غرض ہے۔ مگر مقصد تو یہ ہے کہ عقل کچھ چیز نہیں مطلوب شے جنون ہے۔ اب یہ کہو گے کہ پہلے مصرعہ میں لفظ عشق ہے نہ کہ جنون۔ اے جاہل! عشق ہی کا دوسرا نام جنون ہے۔ قیس کو عشق تھا اسی لیے اُسے مجنوں کہتے ہیں۔ یہ منقولی دلیل تھی جو مَیں نے دی ہے معقولی دلیل کا مَیں قائل ہی نہیں ہوں۔ تو مطلب یہ ہے کہ عقل ظنّی شے ہے جنون کی بنیاد یقینِ محکم پر ہے۔ لہذا عقل ادنیٰ ہے جنون اعلیٰ ہے۔ عقل ناقص ہے جنون اکمل ہے۔ عقل باطل ہے جنون حق ہے۔ عقل جامد ہے جنون متحرک ہے۔ حرکت میں برکت ہے۔ پس اگر فلاح چاہتے ہو تو جنون کی برکتوں سے اپنی جھولی بھر لو۔ عقل پر انحصار نہ کرنا۔ یہ کاغذ کی ناؤ ہے آج ڈوبی کہ کل۔"

"اے حضور! بابو فضل الٰہی کا لڑکا جو بیلی بھیت میں ماسٹر ہے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ عقل ہی سے لوگوں نے سائنس اور فلسفہ میں ترقی کی ہے تم بھی عقل سے کام لیا کرو۔ تو کیا وہ غلط کہہ رہا تھا؟"

"تم نے پھر بالکل غَلَط کہا اور وہ بھی غَلَط کہہ رہا تھا۔ تم سمجھتے ہو دُنیا نے ترقی کی ہے؟ دُنیا تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ تمہارے فلسفہ اور سائنس نے دُنیا کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ سائنس کیا ہے؟ تجربات اور مشاہدات کے لق و دق صحرا میں فنونِ جاہلیّہ کا ایک عظیم الشان سراب۔ فلسفہ کیا ہے؟ خواہشاتِ نفس کی رذیل بنیادوں پر اوہامِ باطلہ کا شیش محل۔ جسے علم الیقین کا ایک چھوٹا سا پتھر چکنا چور کر سکتا ہے۔"

"بے شک۔ بے شک۔ آپ نے درست فرمایا مولانا! معاف کیجئے گا مَیں نے آپ کو باتوں میں لگا لیا۔ حلوہ اور لیجئے نا!"

"جزاک اللہ۔ مَیں اب اور نہیں لوں گا۔ میرا یہ شروع سے قاعدہ رہا ہے کہ جب دوسری دفعہ ڈکار آجائے تو کھانے سے ہاتھ اٹھا لیتا ہوں۔ ورنہ ایک دفعہ مَیں نے اس

قاعدہ کی خلاف ورزی کی تھی جس کا خمیازہ یوں بھگت رہا ہوں کہ اب معدہ ثقیل غذا ہضم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مجھے مجبور نہ کرو ایسا نہ ہو کہ تمہاری دلجوئی کی خاطر میں اپنی صحت برباد کر بیٹھوں۔"

"بہت بہتر جیسے آپ کی مرضی۔ اوہو! ماشاءاللہ! آپ کی جوتی تو نہایت عمدہ ہے۔ کہاں سے بنوائی آپ نے؟" عمادالدین نے تحسین آمیز لہجے میں پوچھا۔

"بھئی! اس جوتی کا قصہ بہت لمبا ہے۔ دودیوڈ کا چوہدری جب بسترِ مرگ پر تھا تو میں اس کی عیادت کے لئے گیا۔ اپنی خداداد قابلیت اور علم طب کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا کہ چوہدری صاحب کا قیام اس دارِ فانی میں محض چند روزہ ہے۔ اچانک میری نظر اُن کی نئی جوتی پر پڑی اور چند لمحوں کے لئے میں اس کی مضبوطی اور پائیداری میں کھو گیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جب علماء کسی شخص کا جنازہ پڑھاتے ہیں تو اس کے پارچات اور جوتوں وغیرہ پر اُن کا حق جائز تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ میرے دل نے اس وقت یہ گواہی دی کہ عنقریب یہ جوتے میرے پاؤں کی زینت ہوں گے اور دشمن زیر ہوں گے۔ میں ابھی خیالات میں غرق تھا کہ چوہدری نے میرے چہرے کی بشاشت سے میرے احساسات کو پڑھ لیا۔ چنانچہ اُس نے وصیت کر دی کہ اس کے مرنے پر ہرگز اس کی جوتی مجھے نہ دی جائے۔ اگلے ہی روز وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اس کا لڑکا میرے پاس اس کی تکفین و تدفین اور نمازِ جنازہ کے سلسلہ میں آیا اور باپ کی وصیت کی بنا پر جوتی دینے سے اپنی معذوری ظاہر کرنے لگا۔ بھلا اس بدعت کو میں کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا کہ جوتی کے بغیر نہ میت کو غسل دوں گا اور نہ نمازِ جنازہ پڑھاؤں گا۔ آخرکار اللہ نے اُس کا سینہ کھول دیا اور حق بحقدار رسید ہوا۔"

عمادالدین یہ گفتگو سن کر کچھ پریشان سا معلوم ہو رہا تھا۔ آخرکار بولا۔

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ میری لڑکی کی نسبت دودیوڈ کے مرحوم چوہدری کے لڑکے سے ہو چکی ہے اور آج میں نے جناب کو اسی لئے تکلیف دی تھی کہ عرض کر سکوں کہ پرسوں بروز منگل بارات ہمارے یہاں آئے گی اس لئے آپ تشریف لا کر نکاح پڑھا دیں۔ تو کیا میں امید رکھوں کہ آپ پرسوں بعد دوپہر غریب خانہ پر تشریف لائیں گے؟"

"عمادالدین! پرسوں میں تمہارے ہاں نہیں آ سکوں گا اوّل اس لئے کہ دن منگل کا ہو گا جو ہمارے نزدیک منحوس ہے دوئم اس لئے کہ میرے پاس دوسری کوئی جوتی نہیں اور اس جوتی کو پہن کر میں چوہدری کے لڑکے کا نکاح پڑھانا نہیں چاہتا۔ لہٰذا مجبوری ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس تقریب میں شامل نہیں ہو سکوں گا۔"

عمادالدین نے "آپ ہمیشہ شادی غمی میں ہمارے شریک رہے ہیں۔ ہماری بڑی بدقسمتی ہو گی اگر اس موقع پر آپ ہمارے ہاں نہ آئیں۔ یہ دس روپے پیشِ خدمت ہیں آپ جوتی نئی خرید لیجئے۔ باقی رہا منگل کا سوال تو امید ہے کہ آپ کوئی راستہ نکال لیں گے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ علماء کے پاس ہر مشکل کا حل ہے۔ اب وقت ہے کہ آپ اپنے خداداد علم سے ہماری مشکل کشائی فرمائیں۔"

"عمادالدین! تمہارے اخلاص اور صحبتِ صالحین کے لئے تمہارے ذوق و شوق کے پیشِ نظر ایک استثنائی بلکہ اضطراری حالت پیدا ہو گئی ہے۔ لہٰذا بموجب آیتِ کریمہ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ میں اس روز آ جاؤں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ السلام علیکم" +

حدیث نبوی ؐ

طلبُ العِلم فریضۃ علیٰ کلِّ مُسلم و مُسلمۃٍ

علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے +

م۔ رؤف

محترم دوست!

تم سے معذرت کے ساتھ

آغاز تعطیلات کے بعد تم سے ایک اَن جانے راہی کی طرح جُدا ہوا۔ مجھے دوش نہ دینا اگر میں یہ کہوں کہ یہ سب کیوں اور کس طرح سے ہوا ——— بہرحال یعنی بہرطور قصہ مختصر معذرت کے ساتھ اِس شدت کی گرمی میں تمہیں خطاب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور دل میں کچھ خوف بھی ہے کہ مبادا آپ بُرا مان جائیں اور میرے ناکردہ گناہوں میں ایک اَور کا اضافہ ہو جائے ———

جناب شوق! مجھے اگر دعویٰ نہیں تو یقین ضرور ہے کہ میں اپنے دوستوں کی نسبت اپنی طبیعت، اپنے جذبات و خیالات کو بہتر سمجھتا ہوں اور میں نے اپنے خیالات کا اظہار بھی اکثر بار اپنے دوستوں کے سامنے کیا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ اپنے انتہائی مصروف دماغ کی وجہ سے میری اِن باتوں پر کان نہ دھر سکے ہوں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ تم پر میں اپنے آپ کو آشکار کرنے میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں اور اس کا جواب میں شاید تمہیں کبھی نہ دے سکوں۔

میری ہی بدقسمتی کہئے دو سال گزرے گردشِ زمانہ کی بدولت تم سے کالج میں ملاقات ہوئی۔ ملاقاتیں بڑھیں اور دونوں طرف سے 'لوازماتِ دوستی' اس حد تک وسیع ہو گئے کہ ایک لگاؤ کا رشتہ قائم ہو گیا جسے 'اُنسیت'

سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اِس رشتہ کو میں نے آج تک خلوصِ نیت کے ساتھ نبھایا اور آئندہ بھی انشاء اللہ نبھاتا رہوں گا ——— لیکن اِس دوران میں تم نے بارہا خصوصاً تعطیلات سے چند ماہ قبل کچھ ایسی باتوں کا اظہار مجھ سے کیا جو میری حقیر اور ادنیٰ رائے میں 'ناشائستہ' کے عنوان سے لکھی جانی چاہئیں۔ مجھے ایک بات کی معمولی ابتداء بتا کر ——— اس کے بعد ——— ہر بات کو اخفائے راز میں رکھنے کی کوشش ——— مجھ سے بالا بالا صلاح و مشورے ——— پھر اس کے خوفناک انجام، سے خواہ مخواہ ایک غریب کے تعلق کا اظہار ——— واقعات تیز رفتاری سے بدلتے گئے اور میں خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا ———

میرے نادان دوست! کس قدر حقیقت پر مبنی ہے یہ بات کہ "نادان دوست سے دانا دشمن ہزار درجے بہتر ہوتا ہے"۔ لیکن بزرگوں کے اس قول کو صرف اور صرف تجربہ کرنے کے لئے پسِ پشت ڈالتا رہا۔ مگر اب اسی حقیقت سے دوچار ہوں جسے درست کرنا میری قوتِ پرواز سے اونچا اور بہت اونچا ہے۔ ——— لیکن خیر جو ہونا تھا سو ہو چکا ——— ان باتوں سے بھلا اب کیا حاصل؟

قابلِ قدر دوست! تم غیر متوقع طور پر کچھ دن ہوئے 'غریب خانہ' پر وارد ہوئے جس کی میں کبھی امید نہ کر سکتا

تھا۔ چند گھڑیوں کے مہمان کی خدمت مجھ سے جو حق المقدور ہو سکی میں نے کی ـــــ غریب کی کٹیا میں ایک امیرزادے نے قدم رنجہ فرمایا لیکن توقعات کی وابستگی کے وقت غریب کی بساط کو نظر انداز کر گئے ـــــ این حیثیت بقدرِ ہمتِ اوست۔ اور جاتی دفعہ ناراضگی کا اظہار کچھ ایسی معنیٰ خیز نظروں سے کیا کہ حقیر انسان کا سلام کیلئے بڑھایا ہوا ہاتھ تمہارے مقدس ہاتھ سے نہ مل سکا اور بیدردی سے ٹھکرا دیا گیا۔ لیکن تمہارے ساتھی نے اپنے الوداعی سلام سے کچھ حد تک اس کی تلافی کر دی ـــــ

شوقی جی! یقین جانو مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ بھلا اور ہو بھی کیا سکتی تھی؟

❋ ـــــ ❋ ـــــ ❋

محترم شوقی صاحب! مجھے اِس امر کا بخوبی احساس ہے کہ میں 'جنرل آئزن ہاور' کی طرح کا کوئی عظیم المرتبت انسان نہیں ـــــ میری دوستی سے کسی لشر کو کوئی فایدہ نہیں پہنچ سکتا اور میری ناراضگی کسی کا ذرّہ بھر بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بھلا مجھے کیا پڑی کہ میں خواہ مخواہ کسی کی ناراضگی مول لیتا پھروں۔

شوقی جی! میرا یہ اصول رہا ہے کہ میں نے حتی الامکان اپنے دوستوں اور واقف کاروں کے خوشگوار جذبات کو reciprocate کرنے کی کوشش کی ہے اور ناخوشگوار جذبات کے بارے میں 'خاموشی' کو ترجیح دیتا رہا ہوں۔ اب شاید یہ میں نہ بتا سکوں کہ تمہارے اور میرے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے۔ لیکن عزیز دوست! یہ میرے افکار و خیالات کا اظہار یقیناً ہمارے تعلقات کی ترجمانی نہیں بلکہ یہ میرے دل کی آواز ہے ـــــ

قابلِ احترام دوست! تمہاری سمجھ پہ مجھے رشک آتا ہے کہ تم نے اس ناراضگی کا سہارا لیکر اپنے بھلے کے لئے ایک بہت بڑا کام کیا ہے ـــــ

شوقی! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم صحیح معنوں میں میرے دوست بن جاؤ تو ـــــ شاید تم میری دوستی کو کبھی نہ سراہ سکو ـــــ کیونکہ اس دوستی میں کوئی دلفریبی نہیں، کوئی حسن نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ اور آئندہ مستقبل قریب میں تم اِس امر کا تذکرہ فخر کے ساتھ کرو گے کہ میں ایسے انسان کی دوستی سے ملوث نہ ہو سکا۔ بھلا ایسا انسان بھی کس کام کا شوقی! جو اپنے کام بھی نہ آ سکے ـــــ اسلئے بہتر یہی ہے کہ تم جس قدر ممکن ہو سکے مجھ سے اجتناب ہی کرو تو اچھا ہے۔ کیونکہ مجھے اِس بات کا بخوبی علم ہے کہ تمہاری اعلیٰ تعلیم کے ارتقائی دَور جس سُست رفتاری کے ساتھ گزر رہے ہیں وہ تمہارے درخشندہ مستقبل کے لیے زہر کا درجہ رکھتے ہیں اسلئے مجھے کہنے دو کہ ہمارے تعلقات کا اختتام اِس امر کا شدید متقضی ہے کہ تم اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر اپنی پڑھائی کی طرف توجہ کرو اور اپنے والدین کی آشاؤں کو ٹھیس لگانیکی بجائے ان کے دامن کو خوشی کے پھولوں سے بھر دو ـــــ

عزیزم! میں نے ہمیشہ تمہیں بزرگوں کے مقدس مقام سے روشناس کرانے کی کوشش کی اور ان کی اطاعت و خوشنودی حاصل کرنے کی تلقین کی اور اِس بار پھر ـــــ آخری بار ـــــ ایک ڈوبتا ہوا دوست تم سے امید کرتا ہے کہ اس کی اس خواہش کو ہی اگر پایۂ تکمیل تک پہنچا دو تو میں سمجھوں گا کہ مجھے اپنی محنت کا صِلہ مل گیا ـــــ

❋ ـــــ ❋ ـــــ ❋

جنابِ شوقی! جس طرح زندگی کی پگڈنڈیاں اتفاقیہ طور پر تم سے مل گئی تھیں اسی طرح آج جُدا ہو گئیں۔ اور اب میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ تم سے دوبارہ ملاقات ہو گی یا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ہماری ملاقاتوں میں 'وقفہ' اور 'دُوری' بتدریج بڑھتا چلا جائے گا اور مجھے خوشی

ہے کہ تمہاری خواہشِ دیرینہ کی تکمیل کا وقت آ گیا۔ تم ایک جنونی 'ادب نواز' اور بہت حد تک 'شاعر نواز' پاگل سے گھبرایا کرتے تھے اور اُسے 'ادبی موڈ' کے طعنے اکثر دیا کرتے تھے۔ اب وہ تم سے دُور ——— بہت دُور چلا گیا ——— اب تو مسرور ہو نا؟ ——— شوقی جی! ماضی کی حسین یادیں زندگی کے آخری لمحات میں سے گزرتے ہوئے انسان کو ایک دلفریب اور پُرکیف سہارا دیا کرتی ہیں۔ اجنبی دیس میں داخل ہونے والے راہی کو اپنی شیرینیوں میں مدغم کر کے اِس حد تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں اور تم اُن رسیلی یادوں میں سے میری یاد کو بھلا دینے کی کوشش کیا کرو گے ———

⁂

دوست! تمہاری ابتدائی ملاقاتوں کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہے جب ہر چہار طرف سے دل برداشتہ ہو کر تم میری خاموشی میں پناہ لیا کرتے تھے اور میں ہمدردی کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے تمہیں تسکین دیا کرتا تھا اور تمہاری بات کو اطمینان و سکون سے سُن کر تمہاری طبیعت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اکثر اوقات 'باغ جناح' کی سیر کرنی پڑتی۔ اور وہ سہانی شام بھی تمہیں یاد ہو گی جب 'میں اور تم' دونوں خالی جیب گھومتے پھرتے 'فاطمہ گلستان' کے ایک گوشے میں گھاس پہ پھولوں کی خوشنما کیاریوں کے قریب بیٹھے تھے اور تم نے کہا تھا "دوست تمہارے پاس آ کر میں ایک نامعلوم سی تسکین محسوس کرتا ہوں لیکن وجہ بتانے سے قاصر ہوں۔" لو آج تمہیں اس کی وجہ اور اِس تسکین کا پس منظر بتاتا ہوں ——— اپنے ہر دوست کے مذاق کا نشانہ تضحیک بن کر تم اُداس اور ملول ہو جاتے، گھبرا کر پریشان ہو جاتے اور پھر غیر ارادی طور پر تمہارے قدم میری جانب اُٹھ جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ دن میں کئی بار تم غریب خانہ پر حاضری دیتے اور مجھے پا لینے کے بعد اپنے دل کا بخار نکالتے اور میں خاموشی سے تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں سُن کر کبھی سمجھاتا ——— اور پھر کبھی میرے معمولی سے مزاح کو بھی برداشت نہ کرتے ہوئے تم مجھے بُرا بھلا کہتے لیکن میں صرف اور صرف تم میں 'خود اعتمادی' کے جذبہ کو تخلیق کرنے کے لئے سب کچھ برداشت کر جاتا ——— سڑک پہ چلتے ہوئے گدھے کی طرح دولتی یا 'ایک لتی' ملنے کی عادت ——— شوقی! مجھے افسوس ہے کہ آج میرے خیالات کا اظہار تم پہ گراں گزرے گا ——— لیکن صاحبزادے! اپنی انہیں 'حرکات و سکنات' کی بدولت تم نقصان اٹھاتے رہے۔ اور اگر آج میرا یہ خط پڑھ کر اپنے اندر شرم و ندامت کے جذبات محسوس کرو اور اپنے ضمیر کو اپنے اُوپر ملامت کرنے دو۔ اس کی آواز کو غور سے سُن کر اپنی اصلاح کی کوشش کرو تو مجھے یقین کامل ہے کہ تم دُنیا کی مجلسی زندگی میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کر لو گے اور اگر تم نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کی کوشش کی، اپنی بے وجہ ضدی طبیعت اور اکڑپن کے گھمنڈ میں اِن باتوں پر کان نہ دھرا تو پھر تمہارے متعلق کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہو گا ——— میں ایک بات اور کہتا ہوں کہ تم مذاق کو برائے مذاق سمجھو اور اگر مذاق کو برائے ذلت سمجھو گے تو پھر تم شاید مذاق کی اصلیت کو کبھی نہ پا سکو گے اور پھر ہو سکتا ہے کہ مزاح کا اصلی لطف تم کبھی حاصل نہ کر سکو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے اکثر عزیزوں سے محض اس لئے خفا ہو کہ وہ تمہیں تمہاری بچگانہ باتوں کی وجہ سے بے وقوف سمجھتے ہیں اور ہر کس و ناکس تم پہ مذاق کی چوٹیں کرتا ہوا ایک لمحہ کے لئے بھی تو نہیں ہچکچاتا ——— بھلا اِس میں میرا کیا قصور؟

دوست! اب میں بھی یہ بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ تم نے موسم سرما کے آغاز سے کچھ بعد ——— مجھ سے اپنی ہر بات چھپانی شروع کر دی تھی اور ہمارے تعلقات کا دائرہ بہت ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھ سے تم صرف رسماً ملتے وہ بھی اس لئے کہ دُنیا جانتی تھی کہ 'میں اور شوقی' دو گہرے دوست ہیں ——— شوقی! میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان اتنی بے تکلفی رہی پھر بھی ایک اَن جانے تکلف کی آمیزش دُور نہ ہو سکی، شاید

یہ اس وجہ سے ہوا کہ تم مکمل اور پیچیدہ طور سے 'گوبلز' کے نمائندہ بن گئے تھے۔ جھوٹ کا لامتناہی سلسلہ اور مسلسل جھوٹ بولنے کی عادت۔ پھر یہی جھوٹ کا تسلسل اس اَن جانے تکلّف کا پس منظر تھا۔ مَیں ٹھیک سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا، بہرحال ہمارا تعلق صرف اور صرف 'ظاہری تعلق' ہو کر رہ گیا ——— لیکن دنیا اور تمہارے عزیز یہی سمجھتے ہیں کہ 'مَیں اور تم' دوست ہیں ——— یہ اُن کی بھول تھی ——— حقیقتاً میرے اور تمہارے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو چکی تھی۔ جسے پاٹنے کی نہ تم نے کوشش کی اور نہ مَیں نے۔ مجھے تو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ مَیں اس کے لئے کوئی قدم اٹھاتا یا کوشش کرتا کیونکہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میرا سالانہ امتحان شروع ہونے والا تھا اور مَیں اپنے ہر دوست سے بے نیاز ہو کر، اپنی ہر دلچسپی کو خیرباد کہہ کر، اپنی ہر خواہش کو دبا کر صرف مرکزی خواہش کی تکمیل میں ہمہ تن گوش اور مصروف تھا اور یہ اسی محنت اور دماغ سوزی کا نتیجہ تھا کہ مَیں کامیاب رہا ——— لیکن اس دَوران میں تم نے وہ کچھ کیا ——— جسے سوچ کر مَیں پریشان ہو جاتا ہوں ——— اور اسکے بعد تم میری 'ذلّت' کے لئے بہت کچھ 'تخلیق' کر چکے تھے جسے دُور کرنا اور اس داغ کو مٹانا میری قوتوں اور ذرائع سے بہت بلند ہے ——— خیر جانے دو اس سب سے بھلا کیا حاصل ———؟

قابلِ قدر دوست! اب نتیجۃً میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم اس 'حقیر دوستی' سے جس قدر ممکن ہو اجتناب کرو تو اچھا ہے ——— اس تعلق کا کیا فائدہ جس میں کوئی حسن نہ ہو ——— اس کلام کی ذلّت میں کیا کلام جس میں کوئی شیرینی نہ ہو۔ شوقی! بھلا جس کو زعفران کی قدر نہ ہو اس کے سامنے اس خوشبو کو ڈھیر کر دینے سے مطلب؟ جس کو 'ساز' کے راز کا علم نہ ہو اس کے ماحول کو ترنم سے مرتعش کرنے سے کیا حاصل ———!

مَیں نے کوئی فسانہ نہیں کہا، کوئی کہانی نہیں لکھی اور نہ ہی تم سے امید رکھتا ہوں کہ تم اسے کوئی 'ادب پارہ' سمجھ کر اپنی عالی ظرفی اور 'ادبی ذوق' کی عظمت کا احساس مجھے دلانے کے لئے مقابلے پر 'اُتر آؤ' (اس کا تو مَیں پہلے ہی قائل ہوں) مَیں اس خط کا جواب بھی نہیں چاہتا۔ ہاں! اپنے حقیر جذبات کا اظہار چاہتا تھا سو کر دیا ——— جی چاہے تو مسکرا دینا ——— جی چاہے تو قہقہہ لگا دینا ——— اور شوقی! آخری بات یہ کہ شاید تمہیں معلوم نہ ہو ——— مَیں بھی ایک عدد ضمیر کا مالک ہوں ——— فقط:-

"مَیں"

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

بقیہ صفحہ ۱۱

دل کی گہرائیوں سے یہ دُعا نکلتی ہے:-

• "اے خدا! تو اِس کالج کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی دے اور اسے اس ظلمت کدۂ دہر میں مشعلِ راہ کا مقام عطا کر"•

پہاڑ کا دامن، دریا کا قرب، کھلی فضا اور علمی ماحول اس کی شان کو دوبالا کر رہے ہیں۔ پہاڑ پر کھڑے ہو کر جب ہم دریا کو دیکھتے ہیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے صنّاعِ قدرت نے ربوہ کے ارد گرد چاندی کی ایک لکیر کھینچ دی ہے جو اسے باقی دُنیا سے ممیز کر رہی ہے۔ کالج کے علمی اور ربوہ کے دینی ماحول نے طلباء کے اندر ایک ولولہ اور جوش پیدا کر دیا ہے اور وہ تحصیلِ علم میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور مَیں نے قوم کے ان ستونوں کی روشن پیشانیوں پر ایک نور دیکھا ہے۔ وہ نور ——— شمع لازوال نور جسے علم کا نور کہا جاتا ہے۔

★

پرویز پروازی

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

چناب کے دائیں کنارے پر کالے کالے مہیب پہاڑوں کی وادی میں جو آج سے چند برس قبل ویران و سنسان پڑی تھی ایک خوبصورت شہر آباد ہے جسے ربوہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اردگرد کی زمین سے ربوہ کی سطح کافی بلند ہے اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں چناب میں جو خوفناک سیلاب آئے وہ اس بستی کو ذرہ بھر بھی نقصان نہیں پہنچا سکے۔

یہ بستی جماعت احمدیہ نے آباد کی ہے اور وہ پروانے جو کبھی قادیان میں جمع تھے اب پھر شمع احمدیت کے گرد اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اس چھوٹی سی بستی میں علم کا ایک بحرِ مواج موجزن ہے اور یہاں کا علمی ماحول دوسرے لوگوں کو ایک مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

ریلوے لائن کے دائیں طرف وسط والی اونچی پہاڑی کے قریب ہی ایک خوبصورت عالی شان عمارت بڑی سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے یہ تعلیم الاسلام کالج کی عمارت ہے۔ کالج لاہور سے اس نیم مکمل عمارت میں منتقل ہو چکا ہے اور پڑھائی شروع ہے۔

آج سے آٹھ نو برس قبل قادیان میں جب اس کالج کی ابتدا ہوئی تو اسے ایک نہایت ہی پُرشکوہ عمارت میں شروع کیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب یہ ڈگری کالج بنا تو اسی جدید ترین آلاتِ سائنس سے مزین کیا گیا۔ غرضیکہ طلباء کی ہر ممکن سہولت کا سامان بہم پہنچایا گیا۔ لیکن وہ سب کچھ تقسیم ملک کی نظر ہو گیا۔

کالج کے طلباء اور سٹاف کی آنکھوں کے سامنے چشم زدن میں اسے سبیل کر دیا گیا۔ حتیٰ کہ ایک کاغذ تک بھی وہاں سے اٹھانے کی اجازت نہ دی گئی۔ ملکی تقسیم کے بعد خداوندانِ پاکستان نے نہایت شفقت سے اس کالج کو لاہور میں نہر کے کنارے ایک اصطبل الاٹ کیا۔ صابر و شاکر طالب علم اور کام کے دھنی اساتذہ وہاں بھی درس و تدریس میں مصروف رہے۔ صحن میں بچھائی ہوئی چٹائیوں پر دن کے وقت کلاسیں کھلتیں اور رات کو وہی چٹائیاں طالب علموں کا بچھونا بن جاتیں۔ غرض کالج نے یہ مرحلہ بھی طے کر ہی لیا۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد اس کو ڈی۔ اے۔ وی کالج کا اگلا حصہ عطا کیا گیا جس کی دہلیزیں تک چولھے کا شکار ہو چکی تھیں۔ لیکن ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

کالج کے اربابِ اقتدار نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا اور تین لاکھ روپے کے مصرف سے اسے اس قابل بنا لیا کہ اسے کالج کہا جا سکے۔ عمارت کے ایک حصے کو بطور کالج اور دوسرے حصے کو بطور ہوسٹل استعمال کیا جاتا رہا اور اب پھر وہی کالج جس کی ابتدا ایک اولوالعزم انسان کے ہاتھوں ایک پُرشکوہ عمارت میں ہوئی تھی اسی اولوالعزم کے اولوالعزم بیٹے کی کوششوں اور کاوشوں کے طفیل اپنی عظیم الشان عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔

آج جب کالج کے باہمت پرنسپل اور ان کے رفقاء ہنستے کھیلتے طلباء کی روشن پیشانیوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے

پروفیسر نصیر احمد خان

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا افتتاح

نوٹ:- مندرجہ ذیل نظم پروفیسر نصیر احمد خان صاحب نے ۷ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو کالج کے افتتاح کے موقع پر پڑھ کر سُنائی۔ جو شکریہ کے ساتھ درج کی جاتی ہے ——— (مدیر)

حدیثِ اوّل

بساطِ گلشن سنور رہی ہے فضا میں مستی بکھر رہی ہے
کلی کلی پھول بن رہی ہے چمن کی رنگت نکھر رہی ہے
ہُوا ہے سرسبز باغِ احمدؑ شگفتہ غنچے مہک رہے ہیں
نہالِ آبِ زلال پی کر بہک رہے ہیں مہک رہے ہیں
پھلا ہے علم و عمل کا بوٹا کھلے ہیں پھل پھول نخل دیں کے
ذرا انہیں کاش کوئی دیکھے یہ سارے ہیں معجزے یقیں کے
فضا میں نغمے بکھر رہے ہیں نسیم رحمت کی چل رہی ہے
کسی کے حسنِ عمل کی دولت سے دل کی دنیا بدل رہی ہے
بلند ہیں آج پھر ارادے بسی ہیں دل میں نئی امنگیں
کھلی ہیں عشق و جنوں کی راہیں مچل رہی ہیں نئی ترنگیں
زمیں نئی آسماں نیا ہے رواں دواں دیں کا کارواں ہے
اور اپنی خوش بختیاں تو دیکھو کہ محمود سا میرِ کارواں ہے

وہ جس کے عزم و یقیں کی ہیبت سے خشک پتھر پگھل پڑے ہیں
کہ آج ربوہ کی وادیوں میں ہزاروں چشمے اُبل پڑے ہیں
چمن کی شادابیاں مبارک خدایا! شاخ و شجر سلامت!
طیورِ احمدؑ پہ تیری رحمت الٰہی! یہ بال و پر سلامت!

حدیثِ دیگر

رمائے بیٹھا ہے کیسی دھونی! یہ کون جوگی یہاں پہ آیا
جواں ہیں کچھ پیر نوجواں ہیں جنہیں یہ اپنے ساتھ لایا
سُنی ہیں اِس کی عجیب باتیں، نرالی بستی بسا رہا ہے
سبق محبت کے دے رہا ہے جنوں کی راہیں دکھا رہا ہے
دلوں کے سب میل دھو رہا ہے یہ بیج اُلفت کے بو رہا ہے
کہ نیم شب میں حسین پلکوں سے غم کے موتی پرو رہا ہے
سُہانے نغمے سُنا سُنا کر رموزِ عرفاں جتا رہا ہے
بَلا کی باتیں بنا بنا کر یہ ہم کو انساں بنا رہا ہے
مبارک اے تازہ تشنہ کامو! شرابِ کہنہ پلا رہا ہے
ہزاروں برسوں کی بھولی بسری حکایتیں پھر سُنا رہا ہے
یہ کون مالی یہاں پہ آیا؟ یہ کیسے بُوٹے اُگا رہا ہے؟
یہ کیسا گلبن بنا رہا ہے؟ یہ کیسا گلشن سجا رہا ہے؟
چمن کا یہ باغباں سلامت! خدایا شاخ و شجر سلامت!
طیورِ احمدؑ پہ تیری رحمت الٰہی! یہ بال و پر سلامت

۶ دسمبر کا مبارک دن

۶ دسمبر ۱۹۵۵ء کی صبح حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز نے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی نئی عمارت کا افتتاح فرمایا۔

صبح آٹھ بجے ہی کالج میں گہما گہمی شروع ہو گئی۔ عمارت کے سامنے لان میں شامیانے نصب تھے۔ نہایت Stewards تندہی سے انتظامات مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ شامیانوں کے نیچے ترتیب کرسیاں سجائی گئی تھیں۔ سٹیج کے دائیں طرف سٹاف کے لئے جگہ تھی اور بائیں طرف باہر سے تشریف لانے والے بزرگان کے لئے نشست بنائی گئی تھی۔ سٹیج کے سامنے پریس گیلری اور اس کے پیچھے مہمانانِ کرام کی جگہ تھی اور پھر باقی سب جگہ طلباء کے لئے مخصوص تھی۔

دس بجے حضور کی تشریف آوری پر تمام سٹاف کی فوٹو کھینچنے کا پروگرام تھا اسلئے تمام اساتذہ گاؤن پہنے ہوئے شاداں و فرحاں حضور کے لئے سراپا انتظار تھے۔ اِس موقع پر ایک لطیفہ ہوا۔ ایک جنگلی (مراد اردگرد کے لوکل باشندوں سے ہے) جو غالباً مزدوری کا کام کرتا تھا چپکے سے ایک طالب علم کے پاس آیا اور نہایت آہستگی سے پوچھنے لگا "باؤ جی! اینہاں جنیاں برقعے کیوں پائے ہوئے نے" طالب علم زیرِ لب مسکرا دیا اور وہ اس کی جانب کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بعد میں یہ لطیفہ چند پروفیسروں کی محفل میں سُنایا گیا اور محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

دس بجکر پانچ منٹ پر حضور کی کار کالج کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ تمام لوگ سراپا ادب ہو گئے۔ حضور نے کار سے اُترتے ہی تمام ممبران سٹاف کو شرفِ مصافحہ بخشا۔ پرنسپل صاحب محترم سب اساتذہ کا تعارف بھی ساتھ ساتھ کراتے جاتے تھے۔ اس کے بعد گروپ فوٹو ہوئی اور بعد ازاں حضور نے کالج کی عمارت کا معائنہ فرمایا۔ معائنے کے بعد حضور سٹیج پر تشریف لائے اور ڈیڑھ گھنٹہ تک حاضرین سے خطاب فرمایا۔

جلسہ کی کارروائی تلاوتِ کلام مجید سے شروع کی گئی۔ تلاوت سردار حمید احمد سیکنڈ ایر نے کی۔ ان کے بعد محمد اسلم صاحب متعلم فسٹ ایر نے بانی سلسلہ احمدیہ کی نظم "خدا تعالیٰ کی جو ذات جاودانی" نہایت خوش الحانی سے پڑھ کر سُنائی۔ بعد ازاں محترم پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب نے اپنی وہ دو نظمیں جو انہوں نے خاص اسی تقریب کے لئے لکھی تھیں پڑھ کر سنائیں اور حاضرین سے خوب داد وصول کی۔ محترم صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب ایم۔ اے آکسن پرنسپل نے سپاسنامہ پیش کیا جس میں آپ نے کالج کی ابتداء سے لیکر آج تک کے حالات کا نہایت کامیابی سے جائزہ لیا اور عمارت کی آئندہ تعمیر وغیرہ کے متعلق اندازے پیش کئے۔ حضور سے امداد حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا پرنسپل صاحب نے اسے ضائع نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے ہوسٹل کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "اگر حضور ۳۰۰۰۰ روپے کی مزید منظوری عطا فرما دیں تو ۔۔۔۔"

حضور زیر لب مسکرا دیئے۔

اس کے بعد حضور نے ایک پُر مغز لیکچر دیا۔ آپ نے علم کی اہمیت کو واضح کیا اور طلباء کو نہایت محنت اور استقلال سے علم سیکھنے کی نصیحت فرمائی۔ آپ نے تعلیم الاسلام کالج کی وجہ تسمیہ بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ تعلیم الاسلام کالج کا صرف یہ مقصد ہی نہیں کہ وہ صرف دینی تعلیم ہی تمہیں دے بلکہ وہ تمہیں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی دے گا۔ تم خدا کی شان کو دیکھو اور سوچو کہ خدا تعالیٰ نے دنیا میں کیا کچھ تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔

آپ نے غیر احمدی طلباء سے فرمایا کہ تم یہ مت خیال کرو کہ تمہیں مجبور کیا جائے گا کہ تم احمدی جماعت کے عقائد کو اختیار کرو۔ ہرگز نہیں۔ تم جس بھی فرقہ سے تعلق رکھتے ہو اس کے مطابق خدا کی عبادت میں مصروف رہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک عیسائی کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی عیسائیت پورا پورا یقین نہ رکھتا ہو۔ اور ایک یہودی کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ یہودیت کے اصولوں پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو۔ اسی طرح ایک مسلمان کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اسلام کے صحیح عقائد پر عمل پیرا نہ ہو۔ اور اس کے صحیح عقائد وہی ہیں جن کو وہ صحیح سمجھتا ہے۔ پس تم اپنے اپنے عقائد پر قائم رہو اور تعلیم حاصل کرو۔ تمہارا مطمح نظر صرف اور صرف تعلیم ہونا چاہیئے۔

آخر میں حضور نے طلباء کی توجہ کالج کی روایات کو برقرار رکھنے کی طرف مبذول کروائی اور دعا کے بعد جلسہ ختم کیا۔

جلسہ کے اختتام پر حضور نے تمام طلباء کو شرفِ مصافحہ بخشا۔ اس کے بعد معزز مہمانوں کے لئے ایک پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا گیا تھا، حضور نے اس محفل کو بھی رونق بخشی۔

دو بجے کے قریب دعوت سے فارغ ہونے کے بعد حضور نے مجلس عاملہ کالج یونین کے ساتھ ایک گروپ فوٹو کھنچوائی اور پھر واپس تشریف لے گئے۔ اس طرح یہ تقریب بخیر و خوبی انجام پائی۔

باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں میں ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج سرگودھا، سرگودھا کالج کے سٹاف کے ممبران اور شیخ عطاء اللہ صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج چنیوٹ کے اسماء گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس تقریب کے انتظامات کے سلسلے میں محترم پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب پریذیڈنٹ کالج یونین اور ان کے رفقاء کار شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے نہایت تندہی سے اس فریضہ کو سرانجام دیا۔

ادارہ الفضل حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز، محترم پرنسپل صاحب، اساتذہ کرام اور طلباء کی خدمت میں افتتاح کی مبارک تقریب پُر خلوص مبارک باد پیش کرتا ہے۔

دلفریب مناظر کی وادی ——— کاغان

(ابن احمد)

اِمسال موسمِ گرما کی تعطیلات میں ہماری پارٹی کو کاغان جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے لئے کاغان ایک نئی دریافت تھی۔ وادیٔ کاغان کی سیاحت پر روانہ ہونے سے قبل صحیح معلومات آپ کو صرف اسی پارٹی سے مل سکتی ہیں جس نے کاغان کی خود سیاحت کی ہو۔ آپ انفارمیشن بیورو کی طرف سے شائع شدہ لٹریچر کا بھی مطالعہ کیجئے۔ لیکن کاغان دیکھنے سے قبل صحیح معلومات کسی پارٹی سے حاصل کر لیجئے۔ ورنہ آپ کو بعض تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اِس ضمن میں ایک تو یہ ضروری ہے کہ آپ بالاکوٹ سے جیپ کی سیٹیں اور راستہ کے بنگلے اپنے پروگرام کے مطابق ضرور ریزرو کروالیں۔ وادیٔ کاغان کا بالائی حصہ اچھا خاصہ سرد ہے۔ اس کے لئے موسم کے موافق گرم بستر ہمراہ ہونا چاہیئے۔ دستانہ، فلیٹ بوٹ (اگر باٹا کا ہو تو سب سے زیادہ آرام دہ پہاڑ پر یہی جوتا ہے) ٹھنڈی عینک، کھڈ سٹک اور گرم کپڑے آپ کو اپنے ساتھ لے لینے چاہئیں۔ عام پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ کاغان میں مرغ سستا ہے اور عام مل جاتا ہے، یہ درست نہیں۔ بالائی کاغان میں آپ کو گوشت ملنا بھی مشکل ہوگا۔ آپ کو کچھ جام، اچار، خشک دودھ اور آلو وغیرہ اپنے ساتھ لے لینے چاہئیں۔ بالائی کاغان میں آپ کو سبزی بھی نہ مل سکے گی۔ آٹا، چاول، کھانڈ وغیرہ آپ ایبٹ آباد سے لیں تو بہتر ہے۔ ناران سے بھی (جو کہ وادیٔ کاغان کے وسط میں ہے) خورد و نوش کا سامان لے سکتے ہیں۔

بالاکوٹ میں جو کہ وادی کا دروازہ ہے آپ کو ایسے سیاح بھی ملیں گے جو کہیں گے "من نہ کردم شما حذر بکنید"۔ آپ کاغان نہ جائیں۔ لیکن ایسا کہنے والے وہی ہوتے ہیں جو قدرتی مناظر کی بجائے مصنوعی مناظر اور خاموشیٔ فطرت کے مطالعہ کی بجائے مری اور ایبٹ آباد کی گہما گہمی کو پسند کرتے ہیں۔ جفاکشی کی بجائے تن آسانی کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ بعض احباب تو کاغان سے مراجعت پر لوگوں کو مشورہ بھی دیتے ہیں کہ کاغان کو جانے والو! اس کو جا کر دیکھنے کی بجائے اس کی تصاویر ہی دیکھ لو۔

یہ مختصر معلومات تھیں، اب ذیل میں وادیٔ کاغان کے متعلق اپنے تاثرات عرض کرتا ہوں۔

ٹیکسلا:۔

ٹیکسلا سے حویلیاں کے لئے گاڑی بدلنا پڑتی ہے اور اگر آپ چاہیں تو یہاں آثارِ قدیمہ اور عجائب گھر دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں چھ سو سال قبل مسیح کے شہروں کے کھنڈرات ملیں گے۔ یہ ایک مستقل اور طویل مضمون ہے اسلئے اِسے یہیں چھوڑ کر کاغان کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔

ٹیکسلا سے گاڑی بدل کر آپ حویلیاں کے لئے روانہ ہوں گے۔ یہ آخری اسٹیشن ہے جہاں سے موٹر کے ذریعہ

ایبٹ آباد پہنچ کر آپ بالاکوٹ پہنچیں گے۔ بالاکوٹ کاغان کا دروازہ ہے۔

بالاکوٹ :۔

اس کی بلندی تین ہزار فٹ ہے۔ یہ وہ مشہور تاریخی قصبہ ہے جہاں حضرت سید احمدؒ (بریلوی) سید اسمٰعیلؒ شہید اور سکھوں کے درمیان حق و باطل کا معرکہ قائم ہوا تھا۔ اڈہ کے قریب ہی سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔ ان کے مزار پر دُعا کے لئے حاضر ہوا تو آنکھوں کے سامنے نظارہ پھر گیا کہ گویا آج بھی وہ مردِ مجاہد سکھوں سے مصروفِ پیکار ہے اور ان وادیوں میں تکبیر کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ان کی بلندی درجات کے لئے دعا کی، اس علاقہ کے لوگوں کے لئے دعا کی۔ خدا تعالیٰ سے ہمت، دین کی عزت اور حریتِ ضمیر مانگی۔

سید احمدؒ شہید رحؒ کے متعلق بالاکوٹ کے مولویوں نے فتوے دیئے تھے کہ یہ وہابی ہے اسلئے لوگوں کو ان سے دُور رہنا چاہیئے۔ وہ مسجد بھی دیکھی جہاں حضرت سید احمدؒ رہتے تھے اور وہ مسجد بھی دیکھی جہاں سید اسمٰعیلؒ فروکش تھے۔ سکھوں سے لڑائی کے وقت پہلے معرکہ میں سکھوں کو شکست ہوئی لیکن آخر میں کسی مسلمان کی غداری کی وجہ سے سید اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ کو شکست ہوئی۔ دونوں بزرگ شہید ہوئے۔ دونوں مزار علیحدہ علیحدہ ہیں۔ قبریں بکھری ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں مجاہدین شہید ہوئے وہیں دفن کر دیئے گئے۔

کاغان کا اصل قصبہ اُدپر ہے۔ دریا کے دونوں طرف نئی آبادی ہے۔ پُرانا شہر مسمار ہو رہا ہے گلیاں سخت گندی ہیں۔ سکھوں کا مسمار شدہ گوردوارہ بھی دیکھا۔ یہاں ہمارے مہمان نواز اس قصبہ کے مشہور رئیس غلام سرور خان صاحب تھے۔ تاریخی قصبہ بالاکوٹ کنہار کے کنارے واقع ہے اور اب کاغان کا دروازہ ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ یہ مشہور منڈی بھی ہے۔ ہر غیور مسلمان کے دل و دماغ پر یہاں سید احمدؒ اور سید اسمٰعیلؒ کا معرکہ حق و باطل چھایا رہتا ہے۔ کہ گویا آج بھی عالمِ تصویر میں بالاکوٹ کے میدانوں میں تلواروں کی جھنکار، بندوقوں کی باڑ اور تکبیر کے نعرے سنائی دے رہے ہیں۔

وادیٔ کاغان کو روانگی :۔

بالاکوٹ سے جیپوں پر کاغان کے لئے روانہ ہوئے۔ سیٹوں کی ریزرویشن تھی۔ دس سیٹیں ریزرو تھیں لیکن سفید چمڑی والے تین انگریز آ گئے تین سیٹیں ان کو دے دی گئیں۔ راستہ میں انگریز پادری کہنے لگا۔ احمدی سب مسلمانوں سے خراب ہیں کہتا ہے مسیح آ گیا جب ہمارے کالج کے ایک لڑکے نے آڑے ہاتھوں لیا تو مُنہ پھیر کر اپنے ساتھی سے بات کرنے لگ گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ پادری صاحب بالاکوٹ مشن کے انچارج ہیں سیاحت پر آنے جانے والے انگریزوں کے ساتھ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ گویا مشن ہاؤس پولیٹکل ایجنسی ہے۔ ناران بالاکوٹ سے پچاس میل ہے۔

سڑک کافی تنگ اور بہت خطرناک ہے۔ اس سڑک سے صرف جیپ جا سکتی ہے۔ ہمارا ڈرائیور کریم نواز بڑا ایکسپرٹ ڈرائیور تھا۔ سڑک دریا کے کنارے کنارے جا رہی ہے۔ دریا کافی گہرائی میں ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ سڑک بہت بلندی پر ہے۔ نیچے ہرے بھرے کھیت اور اس کے نیچے دریا کا پانی پگھلی ہوئی چاندی کی مانند تھا۔ صبح کا سہانا وقت تھا۔ نسیمِ سحری اور پھر جیپوں کا سفر۔ کاغان کی وادی عجیب نظارہ پیش کر رہی تھی جو عمر بھر نہیں بھول سکے گا۔ آج بھی جیپوں کا

قافلہ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر بت پر چڑھ کے درخت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے ہیں۔

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

بعض جگہ سڑک درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی بعض جگہ پتھر کاٹ کر سڑک بنائی گئی ہے، پتھر سڑک کے اوپر جھکا ہوا ہے اور نیچے سے جیپ گزر رہی ہوتی ہے۔ گلگت سے قافلے آ رہے ہیں۔

اگست کا مہینہ تھا، گوجروں کے قافلے میدانوں کیلئے رواں تھے۔ ایک طرف علاقہ کی خوبصورتی تھی دوسری طرف لوگوں کی مفلوک الحالی۔ پھول کے پہلو میں خار کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ ان لوگوں کے لئے دعا کرتے ہوئے گزر گئے۔ گلگت کی طرف سے آنے والی خچریں اور گھوڑے کتنے جفاکش اور خوبصورت تھے۔ دریا کا پانی پتھروں پر سر پٹک کر جھاگ پیدا کر رہا تھا۔ راستہ میں بعض جگہ برف کے تودوں پر سے جیپ گزری۔ ہزاروں ٹن برف کے ڈھیر جگہ جگہ پڑے تھے۔

ناران :-

یہ قصبہ وادیٔ کاغان کے وسط میں ہے۔ اسکی بلندی -۹۸۷ فٹ ہے۔ یہاں رہائش کے لئے ہوٹل بھی مل جاتے ہیں اور سرکاری بنگلے بھی۔ لیکن یہاں بنگلے کی رہائش مشروط ہے کہ جو بنگلہ میں ٹھہرے کھانا بھی بنگلہ سے ضرور کھائے۔ پارٹیوں کے لئے یہ شرط بہت مہنگی ہے۔ ہوٹلوں کا معیار کوئی ایسا بلند نہیں ہے۔ کمروں کا فرش کچا تھا لیکن ہوٹل کا مالک بہت ملنسار تھا۔ یہاں گوشت چار روپیہ سیر ہے۔ نوکر بہت سستے مل جاتے ہیں۔ وادیٔ کاغان کے ہر پڑاؤ پر اب Youth Hostel بھی بن گئے ہیں۔ ناران میں یوتھ ہوسٹل بڑی پر فضا جگہ پر واقع ہے۔ ہمارے کالج کے طالب علم بار بار یہ کہتے تھے کہ اگر یہاں کالج ہو تو دو سال کا نصاب ایک سال میں ختم ہو سکتا ہے۔ رات کو یہاں لوگ سینما کی بجائے لڑکوں کے ناچ سے دل بہلاتے ہیں۔ یہاں دریا اور قصبہ کی سطح ایک جتنی ہے۔ ارد گرد بلند پہاڑ ایستادہ ہیں۔ کئی دفعہ رات کی تاریکی اور خاموش فضائیں دریا کے شور سے حظ اٹھاتے رہے۔

سیف الملوک :-

وادیٔ کاغان میں مشہور جھیل جس کے متعلق کئی افسانے مشہور ہیں ناران سے ۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ جھیل ۱۰۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ شدید چڑھائی پر ہے۔ برف پر سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔ جھیل کا پانی گہرا نیلا تھا۔ تیز ہوا سے جھیل میں سردی پیدا ہو رہی تھی۔ ایک طرف سے پانی آتا تھا، دوسری طرف سے اچھا خاصہ نالہ اس میں سے نکلتا تھا جو دریائے کنہار میں جا کر ملتا ہے۔ سیف الملوک کو جانے والا راستہ بہت خطرناک ہے۔ بعض دفعہ برف کے تودے دیکھے جن کے نیچے سے پانی جا رہا ہے اور اوپر برف کا پل بنا ہوا ہے جھیل سے واپسی پر کچھ بارش ہو گئی لیکن خدا کا شکر کہ ہم اس وقت خطرناک راستہ طے کر چکے تھے۔ چونکہ گوجر واپس جا رہے تھے ان کے مکان خالی تھے۔ اندر سے مکان دیکھے دروازے ندارد۔ مکان کے ایک حصہ کے اوپر چھت بھی نہیں تھی۔ چولھے پتھر گاڑ کر بنائے ہوئے تھے۔ وہیں ایک طرف مویشیوں کے لئے جگہ اور وہیں اپنے سونے کی جگہ۔ یہاں آ کر بھی جھیل کے متعلق شہزادی اور دیو کے قصے سنے۔ ادھر ادھر جھیل کے چاروں طرف برف جمی ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ سارا سال یہاں برف پڑی رہتی ہے۔ سال میں صرف ڈھائی ماہ برف پگھلتی ہے۔ قدرتی پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے۔

ناران سے سیف الملوک تک گائڈ چار روپے لیتے ہیں۔

بٹہ کنڈی :۔

ناران سے پیدل سفر کا آغاز ہوا۔ سامان خچروں پر لاد اگیا۔ بٹہ کنڈی ناران سے اگلا پڑاؤ ہے۔ اس کی بلندی ۹۵۷۵ فٹ ہے۔ ناران سے لیکر بٹہ کنڈی تک دریا بالکل ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ چار میل کے فاصلہ پر سوچان نامی جگہ پر پڑاؤ کیا۔ کھانا وغیرہ کھایا۔ راستہ میں جگہ جگہ آبشاریں دیکھیں۔ فوٹو لیے۔ پاگی کے علاقہ کے لوگ، نمک وغیرہ لیکر جا رہے تھے۔ ایک آدمی سے ایک بوٹی ملی جو سفر کے وقت وہ لوگ منہ میں رکھتے ہیں تاکہ پیاس نہ لگے۔ جو لوگ سردیوں میں بھی یہیں رہتے ہیں وہ سردیوں کے موسم کے لیے ہر چیز ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ کفن وغیرہ بھی رکھ لیتے ہیں۔ اگر کوئی مر جائے تو برف میں ہی لاش دبا دیتے ہیں۔ پھر برف پگھلنے پر قبر کھود کر لاش دفن کر دیتے ہیں۔ ہم نے یہ سنا تو ہمارے ایک ساتھی کہنے لگے کہ پھر تو بچارے دو دو دفعہ روتے پیٹتے ہونگے۔

بٹہ کنڈی کی وادی بہت کھلی ہے۔ عورتیں اکثر بے پردہ پھرتی ہیں۔ تمام علاقہ میں صرف ایک عورت کو سفید برقعہ پہنے دیکھا جو کہ گوجروں کے قافلہ میں پیچھے جا رہی تھی۔ گوجروں کے عام لوگوں کے داڑھی تھی۔ جَو کی فصل یہاں اگست میں پک رہی تھی۔ ایک مقامی آدمی کو دیکھا وہ بیچ سڑک پر گھوڑا سرپٹ دوڑائے جا رہا تھا۔ یہاں دو ڈاک بنگلے تھے۔ ہمارے ساتھ Tents بھی تھے لیکن لگانے کی نوبت نہ آئی اور بنگلہ میں ہی جگہ مل گئی۔

بوراوائی :۔

بوراوائی بٹہ کنڈی سے آٹھ میل دو فرلانگ دُور اگلی منزل ہے۔ اس وادی کی بلندی ۹۵۷۵ فٹ تھی۔ لیکن ریسٹ ہاؤس ۱۰۰۰۹ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ راستہ میں ڈونگا پیر کی زیارت آئی۔ (بٹہ کنڈی سے پانچ میل کے فاصلہ پر اس علاقہ کی مشہور زیارت گاہ، یہاں بزرگوں کی قبروں کو زیارت کہتے ہیں) راستہ میں ایک آدمی جس نے کندھے پر بچہ اٹھایا ہوا تھا ملا۔ ہم نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ کہنے لگا۔ بچہ بیمار تھا۔ اسکی نذر مانی تھی، اب پیر کی زیارت سے ہو کر آیا ہوں۔ اس نے پوچھنے پر بتایا کہ اس علاقہ میں ڈاکٹر کوئی نہیں ملتا۔ گورنمنٹ کی طرف سے کبھی سفری ڈاکٹر آجاتا ہے جس کا ہیڈ کوارٹر ایبٹ آباد ہے۔ لوگ بہت پیر پرست اور قبر پرست ہیں۔ بزرگوں کی قبروں پر مختلف رنگوں کے جھنڈے وغیرہ گاڑے ہوتے ہیں۔

یہ لوگ عموماً سُنی خیالات کے ہیں۔ گاؤں کے اپنے پیش امام ہوتے ہیں مگر ہر گاؤں میں نہیں۔ گاؤں میں مسجد ضرور ہے لیکن نہ اذان ہوتی ہے نہ نماز۔ لوگ عموماً پانیوں کے کنارے نماز پڑھ لیتے ہیں۔

یہاں سے شمال کی جانب کوہستان کا علاقہ متوازی چلا جاتا ہے اور جانب جنوب آزاد کشمیر ہے۔ کوہستان کے راستہ میں برف کے سیدھے پہاڑ ہیں۔ یہ لوگ ڈاکے وغیرہ ڈال کر گوجروں کے مویشی لیجاتے ہیں اسلئے مختلف چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں جہاں فرنٹیر کانسٹبلری والے مقیم ہیں۔ وہ دورہ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ دوائیاں وغیرہ تھیں۔ علم ہوتے ہی لوگ کثرت سے دوائیاں لینے آتے۔ یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ ایک شخص کو ہمارے ڈاکٹر صاحب نے گلے کے باہر ٹنکچر لگانے کو دی۔ جب ہم باہر نکلے تو وہ گلے کے اندر لگا رہا تھا۔ جب اس کو اس کی غلطی پر آگاہ کیا گیا تو اس نے گلے سے نکال کر باہر لگانی شروع کی۔

یہاں دریا قریب ہے اور نیچے گہرائی میں بہتا ہے۔ Rest House میدان میں ہے۔ سامنے کے پہاڑوں پہ برف پڑی ہوئی تھی۔ یہاں کچھ اوپر سے مظفر آباد (آزاد کشمیر) کی طرف راستہ جاتا ہے۔ مظفر آباد کے راستہ میں پہاڑوں پہ بہت زیادہ برف پڑی ہوئی تھی۔ دریا کا پانی برف کی مانند ٹھنڈا تھا۔ علاقہ کے گوجر لوگ نیچے جا چکے تھے لہذا دودھ نایاب تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں میں نمک، مٹی کا تیل اور گھٹیا قسم کا گڑ و شکر ملتی تھی۔ لوگ ذخیرہ کرنے کیلئے گھاس وغیرہ کاٹ رہے تھے۔

بیسال:-

بیسال بورا وائی سے گیارہ میل پر اگلا پڑاؤ ہے۔ اس کی اونچائی ۹۲۰۰ فٹ ہے۔ یہاں کوئی ڈاک بنگلہ نہیں ہے۔ فرنٹیر کانسٹیبلری کا عملہ بہت با اخلاق تھا انھوں نے ہماری رہائش کا انتظام کیا اور رات کے وقت گانوں سے بھی محظوظ کیا۔ بورا وائی سے لیکر بیسال تک راستہ بہت خوبصورت تھا۔ چشمے بہت زیادہ تھے۔ یہاں دریا اور سڑک ایک ہی سطح پر ہیں۔ سبزہ اور پھول بہت ہیں ہم نے راستہ میں قدرتی پھولوں کے گلدستے بنائے۔ یہ راستہ بہت پُر فضا تھا۔ قدرتی پھولوں کے تختے اور سبزہ دریا کے پہلو میں ایسا عمدہ نظارہ پیش کر رہے تھے کہ الفاظ میں ان کا نقشہ کھینچنا محال ہے۔ آنکھ دیکھتی تھی اور دل محسوس کرتا تھا۔

یہاں درخت کم ملتے ہیں۔ لوگوں کی گذر اوقات بھیڑ بکریوں پر ہے۔ سرسبز پہاڑوں پر چرتی یوں معلوم ہوتی تھیں جیسے سبز کپڑے پر رنگا رنگ کے موتی جڑے ہوں۔ راستہ میں تنگی کے پٹھانوں کا ایک ڈیرہ دیکھا۔ یہ لوگ پندرہ سال سے ہر سال یہاں آتے ہیں۔ راستہ میں ایک قافلہ کے بچوں کو پیسے تقسیم کئے۔ یہ سڑک کے کنارے سستا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے قریب آنے سے بھی بچے ڈرتے تھے نہ جانے کیوں؟ لوگ دوائیوں کی خیرات مانگتے تھے۔ ایک مولوی صاحب سے پوچھا تمہارا پیر کون ہے؟ جواب دیا محمدؐ رسول اللہ۔ پٹھانوں کے ڈیرہ میں ایک مولوی صاحب بچوں کو پڑھاتے تھے۔ ایک بچہ سے سورہ فاتحہ امتحاناً سنی۔ جنگل میں دو سمور دار بلیوں کو دیکھا۔ راستہ میں برف کے تودے پڑے تھے ان پر آگے جانے والے ساتھی لکھ گئے "بڑھے چلو!" ہماری پارٹی جب گذری تو اس نے لکڑی سے برف کے تودے پر "احمدیت زندہ باد" کھود دیا۔ ایک زیارت پر کثیر جھنڈے اور بانسوں پہ پہاڑی بکروں کے سینگ لٹکائے ہوئے دیکھے۔

وادئ کاغان میں ہماری آخری منزل

جھیل لولوسر:-

یہ دریائے کنہار کا منبع ہے جو ساری وادئ کاغان سے گذر کر اسکے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ بیسال سے تین میل آگے ہے۔ ۱½ میل لمبی نہایت خوبصورت جھیل ہے جس کے اردگرد پہاڑ ہیں۔ اور پہاڑ اور جھیل کے درمیان ہر طرف قدرتی پھولوں کے تختے۔ یہاں اذان کے بعد عصر کی نماز پڑھی اور شام کے جھٹپٹے میں واپس لوٹے۔ جھیل کے پانی کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ ہوا سے اس میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ کنارے کے پتھر بھی نظر آتے تھے۔ کہتے ہیں اس جھیل کی گہرائی اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ جھیل کے ایک کنارے پر برف کے تودے تھے اتنی حسین و جمیل جھیل عمر بھر میں نے نہیں دیکھی۔ سورج کے غروب ہوتے وقت

پانی میں گئی رنگ پیدا ہوتے۔

لالہ زار:۔ یہاں سے واپسی پر تہ کنڈی کی مشہور سیرگاہ "لالہ زار" کو دیکھا۔ یہ پہاڑیوں پر ایک سرسبز وسیع میدان ہے۔ جنگلی گلاب اور دوسرے پھول۔ چیڑھوں کے جھنڈ میدان کے حسن کو بڑھاتے ہیں۔ اگر کسی دوست نے ڈلہوزی دیکھی ہو تو وہ دیان کنڈ کا نظارہ آنکھوں کے سامنے لے آئے۔

ناران کو واپس ہوتے وقت یہ ہماری آخری منزل تھی۔ رات کی تاریکی میں ہم بنگلے سے باہر نکل گئے۔ ہمارے ایک ساتھی آج یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

تمتّع من شمیم عرارِ نجدٍ
فما بعد العشیّۃِ من عرارِ

ترجمہ:۔ اے میرے ساتھی! نجد کی وادیوں سے لطف اندوز ہولے شام کے بعد پھر یہ وادی نظر نہ آئیگی۔

الغرض، ہم نے کاغان کی وادی کے چپّہ چپّہ پر خدا کی قدرت کے نظارے دیکھے ہم نے یہاں فطرت کو بے نقاب پایا۔ ہم نے دریا کو پتھروں پر سر پٹکتے دیکھا۔ ہم نے وادی کی آبشاروں میں چاندی کھنکتی دیکھی۔ ہم نے قدرتی پھولوں کے وسیع و عریض تختے دیکھے۔ ہم نے پہاڑوں میں پانی کے سوتے پھوٹتے دیکھے۔ ہم نے وادیٔ کاغان میں قدرت کی جلوہ آفرینیاں دیکھیں، قدم قدم پر قدرت کی رنگینیوں کو دیکھ کر منہ سے بے اختیار سبحان اللہ نکل جاتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر خدا کی عظمت یاد آتی ہر طرف پروردگارِ عالم کا ہاتھ نظر آیا۔ بیسیوں مواقع پر زبان نے حضرت مسیح پاک کا یہ شعر دُہرایا ؎

چشم مست ہر حسیں ہر دم کھاتی ہے تجھے
ہاتھ ہے تیری طرف ہر گیسوئے خمدار کا

غزل

(قاصد ظریف)

ملا ہے حکم کہ آنکھیں بچھا بچھا کے چلے
جو تیری راہ میں آئے وہ سر جھکا کے چلے

جب اختیار چمن پہ نہیں تو ہم کو کیا
نسیم جھوم کے آئے یا ڈگمگا کے چلے

شکایتِ غمِ دوراں کریں تو کس سے کریں
وہ جس پہ ناز تھا ہم کو وہی بھلا کے چلے

چمن میں آئے تو اِس طرح سے بہار آئے
دیارِ گل سے چلے تو لہو رُلا کے چلے

ہزار وسوسے دل میں سما گئے اُس دم
وہ مُنہ کو پھیر کے اپنے جو مسکرا کے چلے

چمن کو آج خود اہلِ چمن نے لوٹ لیا
چراغِ عہدِ وفا پاسباں بُجھا کے چلے

متاعِ دردِ محبّت عزیز تھی قاصد
کسی کے کوچے میں وہ بھی تو ہم لُٹا کے چلے

سمیع اللہ قریشی
فورتھ ایئر (آنرز)

خلاء

دِل کے ویران اور کُہنہ کھنڈرات میں
ایک امید کی شمع تھی
بجھ گئی

چند یادوں کے فانوس تھے
جل گئے

بیتے لمحات کی یاد تھی ——
کھو گئی

کچھ نقوش عہدِ رفتہ کے تھے
مِٹ گئے

اور صحنِ چمن میں خزاں آگئی
کلیاں مُرجھا گئیں
پھُول کمہلا گئے
پھر تخیّل کے اونچے درختوں کے
پتّے بھی گرنے لگے

اور خیالوں کی ٹھہری ہوئی نیلگوں
جھیل کی سطح پہ
کائی جمنے لگی
آسمان کے تلے
تیرتے بادلوں کے اُدھر
ایک اِک کر کے تارے بھی چھپتے گئے
چاند کی چاندنی بھی سمٹنے لگی
تیرگی پھیلتی ہی گئی
اور تنہائیاں
چھا گئیں ہر طرف
زندگی موت کی گود میں سو گئی
موت اندھے خلاؤں میں گم ہو گئی

سمیع اللہ قریشی
فورتھ ایر (آنرز)

جہاں مَیں ہُوں !

فسٹ ایئر کے طلباء کالج میں آتے ہیں تو ایک روایتی شان کے ساتھ۔ داخلہ سے پہلے بڑے بھائی جان نے اپنے تجربات کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے لاکھ بار سمجھایا ہوگا کہ "میاں محمد فاضل کالج میں جا رہے ہو ــــ اب ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کالج کی سرزمین ہی کچھ ایسی ہے کہ نگاہ ذرا اِدھر اُدھر ہوئی اور آپ پھسلے۔ ہوش و حواس گم نہ ہونے دینا ورنہ لڑکے تگنی کا ناچ نچائیں گے اور تم بُدھو کہلاؤ گے"! لیکن کہاں حضرت بھلا فسٹ ایر کے لڑکے ہوں اور اپنے آپ میں رہیں، دو متضاد چیزیں ہیں۔ اس دفعہ ماشاء اللہ کافی نئے چہرے دیکھنے میں آئے ہیں اور چشم بد دُور ایک سے ایک بڑھ کر۔ کیا لحاظ صفات کے اور کیا لحاظ معلوماتِ عامہ سے واقفیت کے۔ پورے کامل واقع ہوئے ہیں۔ چند دن ہوئے اسی زمرے سے متعلق ایک فسٹ ایر بہادر Subjects Change کرنے کی درخواست لیکر پرنسپل صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ اتفاق کی بات ہے مَیں بھی باہر چق سے لگا کھڑا سوچ رہا تھا کہ مضمون تبدیل کرنا بھی ایک متعدی بیماری ہے۔ کوئی ان بھلے مانسوں سے پوچھے کہ اب جو دَوڑ دھوپ کر رہے ہو تو پہلے یہ مضمون لئے ہی کیوں تھے ــــ اسی دوران میں پرنسپل صاحب کی آواز سنائی دی غالباً کہہ رہے تھے۔

"مَیں اصول ہوں، بتاؤ مَیں اصول ہوں ــــ ؟" مَیں بڑا حیران ہوا۔ تھوڑی دیر بعد درخواست لیکر اندر جانیوالے صاحب باہر آئے تو مَیں نے پوچھ ہی لیا "کیوں جی۔ کیا بات تھی آپ تو سب جیکٹس چینج کروانے گئے تھے مگر یہ اصول پر کیا پوچھ گچھ ہو رہی تھی ــــ ؟" خفیف سے ہوتے ہوئے شرماتے ہوئے کہنے لگے "وہ جی کوئی بات نہ تھی، مَیں نے صرف PRINCIPAL کے ہجے PRINCIPLE لکھ دیئے تھے !"

ــــ گویا فسٹ ایئر کے طالب علم کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔

لائبریری میں درمیان کی میز پر ایک "عینک پوش" اپنے سامنے انگریزی کی ضخیم کتاب "کون ــــ کیا ہے ؟" رکھے انگشت شہادت کو لعابِ دہن لگا لگا کر ورق گردانی میں مصروف تھے۔ مَیں نے دُور سے انہیں محوِ مطالعہ پایا تو جی چاہا کہ ذرا قریب سے نیاز حاصل کروں میرے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اور عقیدتمند بھی ان کے اِرد گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ جب مَیں پہنچا تو آپ نیازمندوں کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے انہیں بتا رہے تھے کہ "ہمیں ہر مشہور آدمی کا حال درج ہے آپ مجھ سے کسی کے متعلق پوچھیں مَیں اس کے متعلق آپ کو یہاں سے لکھا ہوا دکھاؤں گا"۔ ان کا لب و لہجہ بالکل دربارِ اکبری کے کسی منجم الملک کا سا تھا ــــ خیر انہوں نے مسٹر غلام محمد گورنر جنرل، چودھری ظفر اللہ خان، مارشل سٹالن اور جانے کس کس کا نام لکھا ہوا دکھایا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یہ صاحب خود بھی واقفیتِ عامہ کو ضروری سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس نہایت اہم مضمون سے آگاہ فرماتے ہیں۔ مَیں خاموشی سے ایک طرف کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ

اچانک میرے قریب کھڑے ہوئے ایک لڑکے نے ان سے سوال کیا "کیوں جی۔ کیا آپ کا نام بھی اس میں ہے؟" اور ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ جب اُن بینک پوش نے بڑی سنجیدگی سے سر کھجاتے ہوئے کہا "یہ دراصل پرانا ایڈیشن ہے اسلئے اس میں نہیں ملے گا" ——— اور میں نے سوچا اب لائبریری سے باہر نکلنے میں ہی بھلائی ہے۔

یونین کے زیر اہتمام ایک مباحثہ ہو رہا تھا۔ طلباء اپنی اپنی تقریر میں دلائل پیش کر رہے تھے۔ عنوان تھا "جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے"۔ ایک جوشیلے طالب علم نے جو غالباً نئے نئے کالج میں داخل ہوئے ہیں اپنی تقریر میں اردو کو بعض نئے الفاظ سے نوازا۔ جوشِ خطابت میں فرمانے لگے "دراصل ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے لئے "دو پاتھیں" معین کر لیں"۔ میں تو فی الواقع یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ "پاتھیں" چہ معنی دارد؟ وہیں بیٹھے بیٹھے بہتیرا سر مارا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دوست سے بھی استفسار کیا مگر وہ بھی ماتھا پکڑ کر سوچتے ہی رہے بتا کچھ نہ سکے۔ گھر آ کر فیروز اللغات دیکھی تو وہاں بھی یہ لفظ نہ مل سکا۔ سخت حیرانی ہوئی۔ آخر بڑے غور و فکر کے بعد یہ مشکل حل ہوئی کہ "پاتھیں" دراصل انگریزی لفظ Path بمعنی راستہ کی اردو ائی ہوئی جمع ہے اور مقرر یہ لفظ تقریر کی روانی میں حاضرین کو بخش گئے ہیں ———

جزاک اللہ ——— ارباب ذوق سے درخواست ہے کہ اُردو میں دخیل الفاظ کی لغت میں ایک یہ نیا لفظ بھی شکریہ کے ساتھ درج فرمالیں اور مقرر کے حق میں دُعائے خیر کریں۔

محترم پروفیسر نصیر احمد خاں طلباء سے اس بات پر مشورہ طلب کر رہے تھے کہ آئندہ یونین کی "سرکاری زبان" کیا ہو۔ سوال اہم تھا اسلئے سیاسی قسم کے طالب علم مشورے دینے میں پیش پیش تھے۔ اکثر یہی رائے دی جا رہی تھی کہ یونین کے اجلاسوں میں انگریزی اور اردو کو برابر کی حیثیت دی جائے۔ اور بات بھی معقول تھی مگر دفعتہً ایک "پراچہ" صاحب یوں گویا ہوئے "کیوں جناب میں بھی کچھ عرض کروں!" نصیر صاحب نے فرمایا "کیوں نہیں، ماشاء اللہ آپکو بھی حق حاصل ہے ——— فرمائیے!" اور پھر جو اُن صاحب نے پنجابی زبان اور اس کی اہمیت پر ایک لمبی تقریر جھاڑی تو کیا عرض کروں بس لطف آ گیا۔ اس وقت مجھے مشرقی پنجاب کے اکالی لیڈر یاد آنے لگے۔ اُنکی تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ اُردو اور انگریزی کے ساتھ پنجابی کو بھی مساوی درجہ دیا جائے اور فی الفور پنجابی زبان میں ایک آل پاکستان انٹر کالجیٹ مباحثہ بھی منعقد کیا جائے جس کیلئے عنوان بھی انہوں نے کھڑے کھڑے ہی تجویز کر دیا تھا جو مجھے اب بھول رہا ہے۔ خیر مشورہ تھا اسلئے بظاہر خاموشی کے ساتھ سُنا گیا۔ کچھ سرگوشیاں ہو رہی تھیں میں نے کان لگا کر سُنا تو لڑکے کہہ رہے تھے ——— یونین نہ ہوئی پیپستان ہو گیا۔ ——— اور نصیر صاحب مسکرا رہے تھے۔

ایک سینئر کلاس کی بات کر رہا ہوں۔ اس دفعہ انہیں ایک "ڈبل ڈوس" قسم کے دوست بھی داخل ہوئے ہیں۔ غالباً انگریزی کا پیریڈ تھا۔ پروفیسر صاحب نے حاضری لگا کر اپنا رجسٹر بند ہی کیا تھا کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھے اور فرمانے لگے "جناب میرا رول نمبر بھی درج فرمالیں"۔ پروفیسر صاحب نے رول نمبر پوچھا اور رجسٹر پر درج فرمانے لگے تو ایک دُبلے پتلے طالب علم نے اٹھ کر کہا "جناب ان صاحب کو ایک کی بجائے دو رول نمبر الاٹ ہونے چاہئیں"۔ اس کے بعد ساری جماعت اس بات کی تائید کر رہی تھی۔ پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے نئے داخل شدہ صاحب سے

پوچھا: "کیوں جی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ کہنے لگے "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں مگر چھوڑ خواہ تین رول نمبر الاٹ ہو جائیں۔ مگر ان صاحب کو یقیناً ادھار رول نمبر الاٹ ہونا چاہیئے۔" خیر یہ تو ایک واقعہ تھا، ہو گیا تجویز یہ ہے کہ کالج کے "ڈبل ڈوس" صاحبان کے متعلق جنید صاحب آفس سپرنٹنڈنٹ کو سوچنا چاہیئے کہ انہیں کیا ایک سے زیادہ رول نمبر الاٹ کرنے کے لئے کوئی گنجائش ہے کہ نہیں ـــــ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر واقعی ایسا ہو جائے تو یہاں اپنے کالج کی تاریخ میں ایک انوکھی بات ہوگی وہاں دوسرے کالجز کے لئے بھی مشعلِ راہ کا کام دیگی۔ یوں بھی ایسے لڑکے اس الاٹمنٹ کے جائز حقدار ہیں۔

ہمارے اکنامکس کے پروفیسر محترم ظفر احمد وٹیس کو کالج میں آنا مبارک ہو۔ اپنے کالج کے پرانے طالب علم ہیں اور یونیورسٹی کے ہونہار طلباء میں شمار ہوتے تھے مگر ایک افواہ ان کے متعلق سچ ہی معلوم ہوتی ہے کہ اکنامکس پڑھ کر اس کی تھیوریاں اپنی ذات پر اپلائی کرنے میں بھی خاصے کامیاب معلوم ہوتے ہیں۔ قد و قامت، جسم اور آواز بھی ان کی ماشاء اللہ "اقتصادی" الفاظ میں "نپی تلی" ہی معلوم ہوتی ہے ـــــ اللّٰھم زد فزد۔

اور آخر میں کچھ یونین کے الیکشنوں کے بارے میں سن لیجئے جن سے ابھی تازہ تازہ فراغت ہوئی ہے۔ فدھ ایر کے طلباء سوچ رہے تھے کہ اپنا ـــــ REPRESENTATIVE کسے منتخب کریں۔ اب ہر شخص یہ سعادت حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بالآخر متفقاً طے پایا کہ پریذیڈ شروع ہو چکا ہے۔ پروفیسر صاحب ابھی آئے نہیں۔ لڑکے بیٹھ چکے ہیں۔ اب جو لڑکا سب سے پہلے کلاس میں داخل ہو وہ بلا مقابلہ پریذیڈنٹ ہوگا سب لڑکے خاموشی سے دروازے کی طرف تک رہے تھے کہ وہ خوش نصیب کون آتا ہے کہ پروفیسر صاحب بھی آگئے۔ پانچ منٹ اور گذر گئے مگر کوئی نہ آیا۔ خیال تھا کہ غالباً اب کوئی نہیں آئے گا کہ اچانک سیالکوٹ کے مہاجر محمد نواز صاحب تشریف لے آئے۔ لڑکوں نے انہیں مختلف قسم کے اشارے شروع کئے مگر انہیں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ اور جب پیریڈ ختم ہوا تو انہیں معلوم ہوا کہ میری قسمت نے یاوری کی ہے اور میں بلا مقابلہ کلاس کا نمائندہ برائے کالج یونین منتخب ہو گیا ہوں" ـــــ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ جس کے سر پہ ہما بیٹھ جائے وہ سردار بن جاتا ہے، آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ بہرحال الیکشن کا یہ نیا طریقہ فائدہ مند ہو سکتا ہے مگر آزمائش شرط ہے +

"غالب کے نام ایک خط"

(بقیہ ص ۳۲)

اور بھی کافی اشعار ہیں جن میں آپ نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے یہی آپ کی ترقی پسندی ہے۔

اب میں اپنے اس خط کو ختم کرتا ہوں اور خدا سے دعا گو ہوں کہ آپ جہاں بھی ہوں خوش ہوں۔

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ مرے نہیں ہیں کیونکہ آپ کا نام اور کام دونوں ابتک زندہ ہیں۔ فقط والسلام

قاصد ظریف

از لاہور

غالب کے نام ایک خط

قاصد ظریف

محترم استاذ المکرم! السلام علیکم۔

ممکن ہے آپ مجھے نہ جانتے ہوں کیونکہ آپ کو یہاں سے گئے ہوئے ایک طویل زمانہ گذر چکا ہے۔ یوں بھی ایک انسان سے ممکن نہیں کہ وہ ہر ایک کو جانتا ہی ہو۔ میں اپنے تعارف کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا کیونکہ خبر نہیں آپ اس وقت کس موڈ میں ہونگے۔ مجھے خوف ہے کہ آپکو اس خط کے پڑھنے کی فرصت بھی ملیگی یا نہیں۔ پتہ چلا ہے آپ آجکل بہت زیادہ مصروف ہیں۔ بہرحال آپ سے گذارش ہے کہ اس خط کو آپ ضرور پڑھ لیں۔ مجھے اس کے جواب کی امید قطعاً نہیں ہوگی۔

آپ کی موجودگی میں کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ آپ کے متعلق کچھ بات بھی کرتا سوائے ذوق مرحوم کے لیکن اس کے باوجود کہ وہ شاہ ظفر کے استاد تھے آپ انہیں بھی خاطر میں نہ لائے پھر اور کون تھا جو آپ کے مقابل میں آتا۔

لیکن جب سے آپ گئے ہیں میں کیا بتاؤں آپ کے متعلق کیا کیا باتیں نہ ہوئیں۔ شاید آپکو علم نہ ہو آپکے مختصر سے دیوان پر کم و بیش اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ابھی نہ معلوم کتنی اور لکھی جائیں گی۔ جب بھی کوئی صاحب اردو شاعری پر کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں وہ آپ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہتے اور آپ کے شعروں کی عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں اور جب آپ کے اشعار سمجھ میں نہیں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کے اشعار میں ابہام ہے خصوصاً آپ کے وہ اشعار جو فارسی بحروں میں کہے گئے ہیں، ان کے لئے معمہ بن کے رہ گئے ہیں۔ چونکہ میں جانتا ہوں آپکو حضرت بیدل مرحوم سے فیض حاصل تھا اور ان کی شاعری سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ کہیں کہیں تو آپنے اس بات کا کھلے الفاظ میں اقرار بھی کیا ہے۔ اسکے علاوہ چونکہ آپ کی تعلیم و تدریس فارسی زبان میں ہوئی اسلئے آپ کے ابتدائی کلام میں فارسی غالب ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ کی زندگی کے ابتدائی ایام میں لوگ اسی روش پر گامزن تھے اسلئے آپنے یہی روش اپنے لئے پسند کی لیکن چونکہ خدا نے آپکو ایک ایسا ملکہ دیا تھا جس سے آپ وقت کی رفتار کا بخوبی پتہ لگا لیتے تھے۔ چنانچہ آپنے فوراً محسوس کر لیا کہ اب لوگ ایسی زبان کو زیادہ نہیں چاہتے تو آپنے فی الفور اس روایتی انداز کو بدل دیا۔ اس تبدیلی کو اسوقت بھی بُری طرح محسوس کیا گیا جس کا علم تو آپکو بخوبی ہوگا ہی لیکن آج بھی اردو شاعری کا طرح نو کا بانی آپکو سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی دور ثانی کی شاعری کا پلہ آج بھی اسی طرح بھاری ہے جتنا کہ آپکی موجودگی میں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے خطوط کے مجموعے نہ بھی چھپواتے پھر بھی آپ کا نام اردو زبان کی تاریخ میں سرفہرست آتا لیکن خیر یہ بھی اردو نثر میں اولیت کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کو سنکر خوشی ہوگی کہ آپ کے یہ خطوط بھی اپنے رنگ میں ہنوز لاجواب ہیں۔ جن لوگوں نے بھی ان کے طرز تحریر کو نقل کرنیکی کوشش کی ہے وہ ناکام رہے ہیں البتہ ان پر آپ کے انداز تحریر کا بھاری اثر پڑا کہ یہ لوگ اپنے اپنے رنگ میں آسان فہم اور دوستانہ بول چال کی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ گویا ایک طرف آپنے اردو شاعری کا رُخ بدلا تو دوسری طرف اردو نثر کو بھی ایک نیا راستہ دکھایا دونوں اصناف آج آپ کی مرہون منت ہیں۔

معاف کیجئے گا بات کہاں سے کہاں جا پہنچی میں آپ سے

یہ کہہ لیا تھا کہ آپ کے اشعار کو آج مختلف رنگ میں دیکھا جاتا ہے اگر آپ اجازت دیں تو اس "مختلف رنگ" کی توضیح کر دوں۔ ورنہ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیا مبہم سی بات ہے۔

ایک گروہ اس زمانے میں ایسا پایا جاتا ہے جو کہتا ہے کہ آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ ہر زمانے میں یکساں محسوس کیا جائے گا یعنی جو نظریہ آپ نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے وہ تمام عالمگیر انسانیت کا نظریہ ہے اور یہی ایک ایسا احساس ہے جو ابتدا سے چلا آیا ہے اور انتہا تک چلا جائے گا۔ کوئی دل ایسا نہیں جو اس احساس سے بے چین نہ ہو جاتا ہو گا۔ زندگی کے لئے اگر سوچ کا ہونا بہت ضروری ہے تو اس کا بھی ہونا نہایت ہی اہم ہے ورنہ زندگی زندگی نہیں۔ اور یہ نظریہ جو آپ نے پیش کیا ہے وہ غم کا نظریہ ہے اور جس کو آپ نے اپنے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً آپ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ غم سے ایک آدمی موت سے پہلے کسی صورت میں بھی فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ جہاں جہاں بھی جائے گا یہ نئے بھیس بدل کر اس کی زندگی میں شامل ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کو آپ نے کامیاب زندگی کا ایک ذریعہ بتایا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں ؏

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یا پھر

مشکلیں مجھ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

اور بھی اس نظریے کی روشنی میں آپ کے اشعار سنتا، لیکن میں ڈرتا ہوں کہیں آپ وقت کی کمی کے باعث خط پڑھنا ہی چھوڑ نہ دیں۔

دوسرا گروہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ آپ نے موت کا مسئلہ بھی کچھ اس رنگ میں پیش کیا ہے جو کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آپ نے کہا ہے ——

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

اسکی تشریح طرح طرح سے کیجاتی ہے اور نئے نئے معنی پیدا کئے جاتے ہیں لیکن جہاں تک میں نے سمجھا ہے اسکا یہی مطلب ہے کہ اگرچہ موت کیلئے خدا نے ایک دن مقرر کر دیا ہے اس سے انسان ایک ساعت بھی آگے پیچھے نہیں جا سکتا لیکن اسکے باوجود میں ڈرتا ہوں کہ سوتے سوتے نہ جانے کس وقت موت کا پیغام آ جائے اور مر جاؤں۔ اسی موت کے خوف کی وجہ سے رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ اگر آپ کے ذہن میں اسکے علاوہ کوئی دوسرا مطلب ہے تو مجھے افسوس ہے میں کسی حال میں بھی اسکی تسلی براہ راست آپ حاصل نہیں کر سکتا۔

تیسرا گروہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ آپ کا خدانخواستہ کسی مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ خدا شاہد ہے اور آپ کا دل بھی گواہ ہو گا کہ اکثر جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آپ کا تعلق اہل تشیع سے تھا مثلاً ——

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست

اسکے علاوہ آپ نے اس بات کی شہادت بھی دی ہے کہ آپ کا تعلق اہل بیت سے تھا۔ کربلا کے غم کا اظہار آپ نے ایک مرثیہ میں بھی تو کیا ہے لیکن آپ کی طبیعت غزل کی طرف راغب تھی اسی لئے آپ نے اس میدان کو چھوڑ دیا۔

شاعر کو انگریز مصنفین نے پیغامبر کہا ہے۔ ہر بڑا شاعر مذہب کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ عوامی شاعر ہوتا ہے یعنی سارے جہان کا درد اسکے جگر میں ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک مقام پر اکٹھے ہو کر آپس میں ایک ہو جائیں۔ اسمیں کیا شبہ ہے کہ آپ میرے علاوہ اور ہزاروں کے نزدیک بھی ایک عظیم شاعر ہیں۔ چنانچہ آپ مندرجہ بالا قول بالکل پورا اترتے ہیں۔ آپ کا نظریہ بھی یہی ہے کہ مذہب میں پارٹی بازی اچھی چیز نہیں ؏

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
اور اگر کوئی برہمن بتخانے میں مرجائے تو آپ اس کو کعبہ میں دفن کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ——— ع

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یہ بتاتے ہیں کہ آپکے دل میں اس بات کی خلش تھی کہ ہندو اور مسلم کے تفرقے مٹ جاتے اور دونوں مذاہب آپس میں اسطرح مدغم ہوجاتے کہ آپس میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔

مگر ایک گستاخی معاف کیجیے۔ مرزا صاحب! اگر آپ شراب پیتے تو کیا بگڑ جاتا؟ اسی ایک نے تو آپ کو بہت زیادہ بدنام کردیا ہے ورنہ بقول آپ کے ع

مجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگر آپ جیسا کہ آپکے جانے کے بعد بہت سے ایسے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے شراب کا اتنا ذکر کیا ہے کہ ان سے بڑھ کر شرابی ہونیکا گمان کسی اور پر نہیں ہوسکتا حالانکہ انکی زندگی حقیقت میں شراب سے بہت الگ تھی اور انہوں نے زندگی میں کبھی شراب کو منہ تک آنے نہ دیا تھا۔ ممکن ہے داغ کے لڑکپن کے وقت آپ پر بڑھاپے کا زمانہ ہوگا۔ اسوقت شاید ہی آپنے انکا نام سنا ہوگا۔ انہوں نے شراب کبھی نہیں پی۔ انکے علاوہ ریاض جو بادشاہ خمریات کے نام سے مشہور ہوئے انہوں نے بھی مطلق شراب نہیں پی تھی۔ امیر مینائی بھی انہیں لوگوں میں سے ایک تھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ بھی ذکر شراب کی حدود سے باہر نہ جاتے تو ولی ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی اعتراض نہیں۔ للہ آپ ناراض نہ ہوں ——— ! بات نکلی ہے تو اس سلسلے میں مجھے ایک بات اور یاد آگئی۔ اگرچہ یہ بات آپ کی نجی زندگی کو تعلق رکھتی ہے لیکن چونکہ یہ بات میں اکثر سنتا رہتا ہوں اسلئے ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی اسکے بارے میں اطلاع دیدوں ورنہ جرأت کہاں کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہو۔ وہ بات یہ ہے کہ آپکی بیوی بھی آپکی اس بادہ نوشی کے سبب بہت ناراض تھیں اور حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ آپکے استعمال کے سامنے برتن بالکل الگ تھے۔ آپ اسلئے ان سے اکثر جدا رہتے تھے۔ زندگی کتنی اچھی گذرتی اگر آپ کی بیوی کو بھی آپ کی یہ عادت ناپسند نہ ہوتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی بات ہوگی ورنہ ظاہر ہے آپ کی زندگی یقیناً اجیرن ہوگئی ہوگی۔ خیر اب اس بحث کو جانے ہی دیجیے۔ یوں آپنے شراب کے سلسلے میں بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

یا

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اگرچہ آپ شراب پیتے تھے اور آپ کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ یہ ایک گناہ ہے مگر عادت سے مجبور ہوکر آپ کو اسکی طرف مائل ہونا پڑتا تھا ورنہ آپ کا دل مسلمان تھا۔ اسی لئے تو اس نے آپ سے یہ شعر بھی کہلوایا ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

شاید اللہ تعالیٰ آپ کو اسی ایک شعر پر بخشدے۔

آپ نے جہاں اور باتیں کی ہیں وہیں اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ آپ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور ایک ہی ہستی ایسی ہے جس میں سے دنیا کی ساری چیزیں نکلی ہیں۔ گویا وہ ایک سمندر اور اسکے چھوٹے چھوٹے قطرے مخلوق کی شکل میں اس سے جدا ہیں۔ چنانچہ آپ کا یہ شعر ؎

نہ تھا جب کچھ خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

میری اس بات کا ثبوت ہے۔

چوتھا گروہ کچھ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو آپکے شعروں میں شوخی، مزاح اور طنز تلاش کرتے ہیں اور آپکے شعروں کو اسی آئینے میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ مثلاً اس سلسلے میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ جنت کے قائل نہیں اور یہ شعر پیش کرکے آپ پر

الزام عائد کرتے ہیں کہ آپ نے خدا سے یہ بات طنزاً کہی ہے ——

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اسمیں تو آپ نے جنت کا اقرار کیا ہے اور اپنی حقیقت کو پہچانا ہے اسی لئے صرف جنت کے متعلق سوچکر ہی اپنے دل کو خوش کر لینے کا واحد ذریعہ تصور کو ہی سمجھا ہے ورنہ ایک بادہ خوار کس طرح جنت کی تمنا کر سکتا ہے مگر وہ اسکے خیال سے تو محروم نہیں ہو سکتا۔ اور آپ نے اپنے لئے اس سے زیادہ تصور بھی کرنا پسند نہیں کیا۔ پھر آپ کی وہ غزل جو آپنے شاہ ظفر کو معذرت کے طور پر لکھی تھی لوگ اسکو صرف مزاح کے رنگ میں لیتے ہیں حالانکہ اسکا ہر ہر شعر طنز سے بھرپور ہے۔ آپ طنز اور مزاح میں فرق سمجھ سکتے ہیں!

باتیں بہت طویل ہوتی جارہی ہیں لیکن آپ یقین جانیئے میں آپکو پہلی بار یہ خط لکھ رہا ہوں۔ پھر نہ جانے کبھی تحصیل سعادت کا موقع نصیب ہوگا بھی کہ نہیں اسلئے آپ دو ایک بات اور سن لیجئے۔

جہاں تک شوخی و ظرافت کا تعلق ہے یہ تلخ اور ترش بات کہنیکا ایک سہل طریقہ ہے۔ سننے والا اسکو سن کر گو وقتی طور پر حظ محسوس کریگا لیکن یہی بات رفتہ رفتہ دل میں نشتر چبھوتی رہیگی اسی لئے آپنے یہ طریقہ اختیار کیا ہوگا ورنہ اسکے علاوہ کوئی دوسری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

ہاں ایک اور گروہ کچھ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو آپکے کلام کو قرآنی آیات سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایک کتاب بھی "دیوانِ قرآن" کے نام سے لکھی گئی ہے۔ میں اسکو غلو سمجھتا ہوں۔ آپ بھی میری اس بات کی تائید کرینگے۔ یہ ضرور ہے جیسا کہ میں نے اسی خط میں ذکر کیا ہے آپکے کلام میں جو بات ہے وہ اب تک کوئی پیدا نہ کر سکا۔

آخری بات بھی سن لیجئے جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ کاش آپ ہمارے موجودہ تہذیب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے موجودہ دور آپکے دور سے بالکل بدل چکا ہے اور ہر لحاظ سے بدلا ہوا ہے۔ مشاعرے میں آپ زیادہ نہیں تو دو چار مرتبہ ضرور گئے ہونگے۔ فرش نشست ہوتی تھی۔ شمع ارد گرد گھوما کرتی تھی لیکن اس زمانے میں اشعار مائیکروفون پر سنائے جاتے ہیں۔ شمع کی روشنی کی جگہ بجلی کی روشنی ہے۔ آجکل اشعار پسند نہیں کئے جاتے بلکہ ترنم پسند کیا جاتا ہے۔ اسکو ترقی کا زمانہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ہر شعبے میں "ترقیت" رچ گئی ہے۔ ادب و شعر میں بھی یہ ترقیت داخل ہو گئی ہے اور اب ہر شعر ترقی پسندانہ طریقے پر سوچا جاتا ہے۔ شمع و پروانہ، گل و بلبل، شراب ساقی اور اسی قسم کے بیشتر اشارے اور استعارے بیکار سمجھے جاتے ہیں اور اسکے بدلے عجیب و غریب نام آگئے ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ردیف و قافیہ کی ضرورت کو بھی بیکار تصور کیا جارہا ہے۔ اگرچہ آپنے شاعری کے رُخ کو دوسری طرف موڑ دیا تھا لیکن آپ نے اردو شاعری کی پچھلی روایات کو برقرار رکھا تھا۔ مثلاً یہی کہ آپ اپنے مخاطب کے لئے ہمیشہ مذکر کا صیغہ ہی استعمال کرتے رہے کبھی اسکو تانیث میں ظاہر کرنیکی جرأت نہیں کی، شاید اس زمانے میں ایسی باتیں پسند نہ کی جاتی ہوں۔ لیکن آج کی دنیا میں یہی بات پسند کی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ اب شاعری کا تیور ہی بدل گیا ہے۔ کاش اس دور میں آپ نہ ہوئے ورنہ معلوم نہیں آپ کہاں بھاگ جاتے۔ ویسے اب آپ جہاں بھی ہوں خدا آپ کے ساتھ ہو لیکن داد دیجئے اس زمانے کے لوگوں کو بھی کہ جنہوں نے آپ کو بھی آج کی ترقی پسندانہ شاعری میں شریک کر ہی لیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ نے اپنے زمانے کے مطابق شعر کہے ہوں گے۔ اشعار چونکہ حالات سے متاثر ہو کر دل کی راہ سے نکلتے ہیں اور اپنے اندر درد اور چبھن کی بے پناہ تاثیر رکھتے ہیں اسلئے آپ کے اشعار بھی ترقی پسندانہ ہیں۔ خصوصاً اس ضمن میں جو آج زبان زدِ عام شعر ہے وہ یہ ہے ——

زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

Almanar

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE